جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مُدیر

پروفیسر خورشید احمد

ادارہ ترجمان القرآن

تعارف قاضی گروپ آف کمپنیز

اور اللہ ہی نے تمہارے لئے گھروں کو رہنے کی جگہ بنایا (القرآن)

قاضی انٹرپرائزز 1988 سے پراپرٹی اور کنسٹرکشن کے شعبہ سے منسلک ہیں۔ الحمد للہ جس ادارہ کی بنیاد تقویٰ، توکل، ایمانداری اور جذبہ خدمت خلق پر رکھی گئی تھی اس کو اللہ تعالیٰ نے دن دوگنی رات چوگنی ترقی سے نوازا۔ رب رحیم کا احسان عظیم ہے کہ ادارہ نے اپنے ذیلی اداروں کی محنت اور تعاون سے ترقی کی اور 1999 میں تنظیم نو کرتے ہوئے (قاضی گروپ آف کمپنیز) کا آغاز کیا۔ قاضی گروپ آف کمپنیز میں مندرجہ ذیل ادارے شامل ہیں۔

★قاضی انٹرپرائزز ★قاضی کنسٹرکشن ★قاضی پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز ★قاضی ٹریولز ★قاضی پی وی سی پائپ انڈسٹری ★اسلامک ویلفیئر فاؤنڈیشن

قاضی انٹرپرائزز ہی کیوں؟ اس لیے کہ

① ہاؤسنگ کے شعبہ میں بہترین تجربہ کار ٹیم۔ ② 4 منصوبے مکمل کرنے کا اعزاز حاصل (جہاں یا تو ہمارے ممبران رہائش پذیر ہو چکے ہیں اور یا پھر پلاٹ فروخت کر کے کئی گنا منافع بھی کما چکے ہیں۔ آپ بھی ہمارے منصوبوں میں سرمایہ کاری کر کے فائدہ اٹھا سکتے ہیں) ③ **منی بیک گارنٹی** ہماری ہی ہے اگر آپ تعمیر دیکھے مکان یا پلاٹ خریدیں اور دیکھنے پر آپ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے بتائے ہوئے منصوبے معیار کے مطابق نہیں ہیں تو آپ اپنی رقم واپس لے سکتے ہیں

④ ہر اتوار کو ہماری گاڑی دفتر سے صبح نو بجے سائٹ وزٹ کے لیے روانہ ہوتی ہے اسلئے پہلے آپ سائٹ دیکھیں اور پھر خریدیں

ہمارے منصوبے

★ الرحمن ٹاؤن (مکمل) ★پاسبان ٹاؤن (مکمل) ★ گلستان راشد فیز (I) مکمل ★ فیملی ولاز مری فیز (I) فیز (II) مکمل
★ فیملی گارڈن اسلام آباد بکنگ جاری ★ موٹروے سٹی فیز (I) فیز (II) بکنگ مکمل ★ فیملی اپارٹمنٹ مری فیز (III) بکنگ جاری
★ موٹروے سٹی فیز (III) بکنگ جاری ★ قاضی اپارٹمنٹ راولپنڈی بکنگ جاری ★ اسلام آباد مل گارڈن بکنگ جاری

ہمارا دعوی ہمارے منصوبے سب سے سستے اور سب سے بہترین، دیکھیں اور فیصلہ کریں

موٹروے سٹی

خصوصیات

☆اسلام آباد کی طرح سرسبز و شاداب پہاڑیوں کے دامن میں
☆نیو اسلام آباد انٹرنیشنل ایئرپورٹ کی بدولت ہر آسائش حو جع
☆تکشیلا میوزیم اور گوردوارہ پنجہ صاحب جیسی سیرگاہیں قریب تر
☆انشاءاللہ تعالیٰ تمام ضروریات زندگی آپ کے دروازے پر
☆پاکستان موٹروے سے چند منٹ کی مسافت
☆فوج کے ریٹائرڈ افسروں پر مشتمل منظم سیکورٹی سسٹم کا قیام
☆اسلامک سنٹر کے لیے پچاس کنال زمین وقف
☆قیمتوں میں اضافہ کی بدولت منافع بخش سرمایہ کاری
☆پانی جیسی نعمت کی فراوانی
☆ہر فیز میں شاپنگ سینٹر
☆کشادہ سڑکیں اور گلیاں
☆مسجد، سکول اور ہسپتال گھر کے نزدیک۔

29 فروری 2000ء تک

خصوصی رعایت

پلاٹ بک کرانے والے کو 15 ہزار روپے فی کنال کی خصوصی رعایت

سائز پلاٹ 5 مرلہ، 10 مرلہ، ایک کنال

تمام ادائیگی بذریعہ بینک ڈرافٹ بنام موٹروے سٹی اکاؤنٹ نمبر 8- ABL 1100 راشد منہاس روڈ برانچ راولپنڈی

یکمشت ادائیگی پر 10 فیصد خصوصی ڈسکاؤنٹ۔ کل قیمت کی پچاس فیصد یکمشت ادائیگی پر فوری رجسٹری

قیمت و طریقہ ادائیگی

قیمت: 9 ہزار روپے فی مرلہ

ایڈوانس: -/1000 روپے فی مرلہ بوقت بکنگ۔

قسط: -/100 روپے فی مرلہ ماہانہ

ہیڈ آفس

قاضی انٹرپرائزز

جنگ بلڈنگ مری روڈ راولپنڈی

فون 554464 فیکس 558633

E-mail: shaukat@isb.comsats.net.pk

web: www.qazi.com.pk

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر : پروفیسر خورشید احمد — نائب مدیر : مسلم سجاد

جلد ۱۲۶ — مئی ۱۹۹۹ء، محرم ۱۴۲۰ — عدد — عدد ۵

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور

فون : ۷۸۴۴۶۰۵

فیکس : ۷۸۴۲۱۹۴

E-mail: tarjuman@pol.com.pk

انتظامی امور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون : ۷۵۸۷۹۹۱ - ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ ۱۵ روپے

زرسالانہ ۱۵۰ روپے

بھارت ۴۰۰ روپے

بنگلہ دیش، ایران ۴۵۰ روپے

مشرق وسطیٰ، یورپ

شرق بعید، افریقہ ۶۵۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ۹۰۰ روپے

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

اسلام کی شان حکمرانی

اسلام کا جہاد تو ایک خشک اور بے مزہ محنت ہے جس میں جان' مال اور خواہشات نفس کی قربانی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر یہ جہاد کامیاب ہو اور نتیجے میں حکومت مل جائے تو سچے مسلمان حکمراں پر ذمہ داریوں کا اس قدر بھاری بوجھ عائد ہو جاتا ہے کہ اس غریب کے لیے راتوں کی نیند اور دن کی آسایش تک حرام ہو جاتی ہے' مگر اس کے معاوضے میں وہ حکومت و اقتدار کی اُن لذتوں میں سے کوئی لذت بھی حاصل نہیں کر سکتا جن کی خاطر دنیا میں عموماً حکومت حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسلام کا فرماں روا نہ تو رعیت کے عام افراد سے ممتاز کوئی بالاتر ہستی ہے' نہ وہ عظمت و رفعت کے تخت پر بیٹھ سکتا ہے' نہ اپنے آگے کسی سے گردن جھکوا سکتا ہے' نہ قانون شریعت کے خلاف ایک پتا ہلا سکتا ہے' نہ اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ اپنے کسی عزیز یا دوست یا خود اپنی ذات کو کسی ادنیٰ سے ادنیٰ ہستی کے جائز مطالبے سے بچا سکے' نہ وہ حق کے خلاف ایک حبہ لے سکتا ہے اور نہ چپہ بھر زمین پر قبضہ کر سکتا ہے۔ ایک متوسط درجے کے مسلمان کو زندگی بسر کرنے کے لیے جتنی تنخواہ کافی ہو سکتی ہے اس سے زیادہ بیت المال سے ایک پائی لینا بھی اس کے لیے حرام ہے۔

وہ غریب نہ عالی شان قصر بنوا سکتا ہے' نہ خدم و حشم رکھ سکتا ہے' نہ عیش و عشرت کے سامان فراہم کر سکتا ہے۔ اس پر ہر وقت یہ خوف غالب رہتا ہے کہ ایک دن اس کے اعمال کا سخت حساب لیا جائے گا اور اگر حرام کا ایک پیسہ' جبر سے لی ہوئی زمین کا ایک چپہ' تکبر و فرعونیت کا ایک شمہ' ظلم و بے انصافی کا ایک دھبہ اور خواہشات نفسانی کی بندگی کا ایک شائبہ بھی اس کے حساب میں نکل آیا تو اسے سخت سزا بھگتنی پڑے گی۔ اگر کوئی شخص حقیقت میں دنیا کا لالچی ہو تو اس سے بڑا کوئی بے وقوف نہ ہو گا اگر وہ اسلامی قانون کے مطابق حکومت کا بار سنبھالنے پر آمادہ ہو' کیونکہ اسلامی حکومت کے فرماں روا سے بازار کے ایک معمولی دکان دار کی پوزیشن زیادہ اچھی ہوتی ہے۔ وہ دن کو خلیفہ سے زیادہ کماتا ہے اور رات کو آرام سے پاؤں پھیلا کر سوتا ہے۔ خلیفہ بیچارے کو نہ اس کے برابر آمدنی نصیب اور نہ رات کو چین سے سونا ہی نصیب

(سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ' ترجمان القرآن' جلد ۱۴' عدد ۳' ربیع الاول ۱۳۵۸ھ' مئی ۱۹۳۹ء' ص ۱۹۱-۱۹۲)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

کوسووا کا المیہ

امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

ڈاکٹر انیس احمد

دور جدید کی تاریخ میں جنگ عظیم اول دنیا کے نقشے پر ہونے والی تبدیلیوں کے حوالے سے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بلقان کے علاقے نے جنگ عظیم کے واقع ہونے میں ایک بارودی سرنگ کا کام کیا تھا۔ آج جب اس واقعے کو ۸۵ برس گزر چکے ہیں تاریخ پھر ایک ایسے مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں دوبارہ بلقان کا علاقہ عالمی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اگرچہ اس طویل تاریخی عمل میں کرداروں کے چہرے تبدیل ہو گئے ہیں، بایں ہمہ تاریخی عوامل میں غیر معمولی مماثلت نظر آ رہی ہے۔ ۱۸۷۸ء کے میثاق برلن کے ذریعے یورپ سے سلطنت عثمانیہ کے اثر و نفوذ کو ختم کرنے اور نسلی بنیاد پر ریاستوں کے قیام کی مغربی حکمت عملی کا آغاز ہوا اور باہمی اختلافات کے باوجود اٹلی، روس، جرمنی، برطانیہ اور فرانس نے سلطنت عثمانیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی کوششوں میں مکمل تعاون اور یک جہتی کا مظاہرہ کیا۔

الکفر ملۃ واحدہ کے اصول کی تصدیق بوسنیا ہرزی گووینا اور کوسووا میں یورپی اقوام کے رد عمل سے بہت کھل کر سامنے آ چکی ہے۔ گو انسانی ہمدردی کی بنیادوں پر بعض یورپی اقوام نے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کی مذمت کی، لیکن یہ مذمت کرنے والے بھی یورپ میں ایک مسلم ریاست کے قیام کو ذہنا اور عملاً ماننے کو تیار نہ ہو سکے اور اس امکان کو کمزور سے کمزور تر بنانے میں باہمی تعاون کرتے رہے۔ حالات کا تجزیہ کیا جائے تو اصل مسئلہ یہی نظر آتا ہے کہ جبر و تشدد، انتقال آبادی، سیاسی عدم استحکام، معاشی دباؤ بلکہ استحصال اور ناکہ بندی، غرض کسی بھی حربے کے ذریعے یورپ کی سرزمین میں مسلم ریاست کے

قیام کے راستے کو مسدود کیا جائے۔ اس گہرے تعصب اور عدم رواداری کی ایک اور یورپی مثال ترکی میں وزیراعظم نجم الدین اربکان اور ان کی پارٹی کے خلاف کارروائی ہے۔ ان کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ ایک ایسے ملک میں جو دستوری طور پر خود کو سیکولر کہتا ہے، انھوں نے اپنے مسلمان ہونے پر فخر کا اظہار کیا اور مسلم ممالک کے درمیان معاشی رابطے و تعاون کے اصول کو اپنانا چاہا۔ جمہوری روایات کو پامال کرتے ہوئے انھیں اقتدار سے محروم کیا گیا حتیٰ کہ تانسو چلر جیسی مغرب زدہ نائب وزیراعظم کو بھی اس حقیقت کا ادراک ہو گیا کہ ترکی اپنے سفید فام اور سیکولر ہونے کے باوجود، یورپی برادری کو اپنے یورپی ہونے پر قائل نہیں کر سکتا اور جب تک ترکوں کا رشتہ، خواہ وہ کتنا کمزور ہی کیوں نہ ہو، اسلام کے ساتھ رہے گا، یورپ انھیں غیر اور اجنبی ہی سمجھتا رہے گا۔

کوسووا چودھویں صدی میں سلطنت عثمانیہ کے زیر اثر آیا۔ ۲۸ جون ۱۳۸۹ کو عثمانیوں نے سربوں کو شکست فاش دے کر اس خطے میں اشاعت اسلام کا راستہ کھول دیا۔ یہ خطہ بھی دیگر اسلامی ممالک کی طرح رنگ، نسل اور خون کی تقسیم سے بالا ہو کر البانی، ترک اور مقامی افراد کی یکجائی کا مظہر بن گیا اور بے شمار مقامی افراد بھی دائرہ اسلام میں داخل ہونے شروع ہو گئے۔ ۶۰۰ سال کے عرصے میں اس خطے میں کوسووا مانٹی نیگرو، مقدونیہ اور دیگر ریاستوں میں مسلم آبادی میں نمایاں اضافہ ہوا اور آج کوسووا ۹۱ فی صد مسلمان اور صرف ۹ فی صد سرب آبادی پر مشتمل ہے۔

۱۹۱۳ میں جنگ بلقان کے نتیجے میں کوسووا ۶۰۰ سال بعد سربوں کے زیر تسلط آ گیا۔ یوگوسلاویہ کی فیڈریشن بننے پر اشتراکی آمر مارشل ٹیٹو نے مسلمانوں کی تحریک آزادی کے پیش نظر کوسووا کو کنفیڈریشن میں داخلی طور پر خود مختار تسلیم کیا، لیکن ۱۹۹۰ میں حقوق انسانی کے قاتل میلاسووچ نے ترکوں کے ہاتھوں سربیا کی شکست کی چھ سو سالہ تقریب کے موقع پر تمام منتخب اداروں کے توڑنے اور اس کی خود مختاری کے خاتمے کا یکطرفہ اعلان کر دیا مگر کوسووا کے باشندوں نے اس آمرانہ فیصلے کو تسلیم نہیں کیا اور ۱۹۹۲ میں ایک ریفرنڈم کے نتیجے میں ۹۹ فی صد آبادی کی رائے اور حمایت سے آزاد جمہوریہ کوسووا کے قیام کا اعلان کر دیا۔ ۱۹۹۸ میں دوبارہ انتخابات ہوئے اور ابراہیم روگووا کو صدر منتخب کیا گیا۔

سربوں نے کوسووا کے انتخاب اور ریفرنڈم کو ماننے سے انکار کیا اور کوسووا کو جارحیت، تشدد اور استحصال کا نشانہ بناتے ہوئے اپنی مسلح افواج کے ذریعے قتل و غارت، لوٹ مار، اور ظلم و جبر کے ذریعے آبادی کے انخلا کا سلسلہ شروع کر دیا۔ زبردستی ہونے والے آبادی کے اس انخلا کے بظاہر یہ مقاصد ہیں:

اول: کوسووا کے باشندوں کو البانی قرار دے کر ان کے پیدائشی انسانی حقوق سے محروم کرتے ہوئے

ملک بدر کر کے منتشر کر دیا جائے تاکہ وہ اس جلاوطنی اور انتشار (Diaspora) کے نتیجے میں خانہ بدوشی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوں جیسا کہ فلسطینیوں کے ساتھ صیہونیوں نے کیا تھا۔

دوم: مسلمانوں کو ملک بدر کر کے سنگلاخ اور برف پوش علاقوں میں بیسیوں میل پیدل بغیر کسی غذا اور دوا کے سفر کی ابتلا و مشقت میں ڈال کر' لاکھوں افراد کو فطری طور پر زندگی سے محروم کر دیا جائے اور اگر ان میں سے کچھ زندہ بچ جائیں تو ان کے سرکاری شناختی کاغذات ان سے چھین کر یا ضائع کر کے انھیں کوسووا واپس آنے سے محروم کر دیا جائے۔

سوم: مستقبل کے نقشے کو سمجھنے کی ضرورت ہے جس کے لیے بوسنیا ماڈل کا کام دے رہا ہے۔ جو کچھ بوسنیا میں ہوا وہی ضروری فرق کے ساتھ کوسووا میں کیا جا رہا ہے۔ پہلے بڑے پیمانے پر قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا گیا۔ اس کے بعد بوسنیا کے مسلمانوں کو منتشر اور تتر بتر کیا گیا اور بالآخر تین علاقوں میں آبادی کو منقسم کر کے کروشیا کے ساتھ ایک ایسے الحاق میں باندھ دیا گیا کہ مسلمان کبھی بھی غالب عنصر اور کارفرما طاقت نہ بن سکیں۔ یہ سب کچھ صلح و امن اور یورپی جمہوری اقدار کے نام پر معاہدہ ڈراٹنن کے ذریعہ مسلط کیا گیا۔ بالکل اسی طرح کا نقشہ اب کوسووا کے لیے بنانے کے صرف منصوبے ہی نہیں ہیں' عملاً ان پر کام شروع ہو گیا ہے۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ کوسووا سے مسلمانوں کے اس بے بسی اور مظلومی کے ساتھ انخلا کے بعد جس کا تماشا ناٹو' مغربی اقوام اور مسلمان ممالک سب دیکھ رہے ہیں اور جس میں ہوائی حملوں کے بعد اصل تیزی آئی ہے' بلکہ ایسا لگتا ہے کہ ہوائی حملوں کے پیچھے ایک حکمت عملی یہ بھی ہے کہ اس علاقے کو پہلے مسلمانوں سے خالی کرا لیا جائے۔ ان سطور کے لکھتے وقت تک مسلمان آبادی کا ۸۰ فی صد اپنے گھربار چھوڑ چکی ہے۔ بڑی اکثریت البانیا میں پناہ گزیں ہوئی ہے جہاں ان کی حالت ناقابل بیان ہے۔ ایک حصہ مقدونیہ (Macedonia) میں نامطلوب مہمان (un wanted guest) کے طور پر گوارا کیا گیا ہے اور ان کو پناہ گزین کی صعوبتوں کے علاوہ ناپسندیدگی اور واپس جاؤ (go back) کے طعنوں کو بھی برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ کوئی دو لاکھ یورپ کے مختلف ممالک میں تتر بتر کر دیے گئے ہیں' کچھ پہاڑوں میں چھپے ہوئے ہیں یا خیمہ زن ہیں۔ حاصل یہ ہے پوری مسلم آبادی کو منتشر کر دیا گیا ہے۔ نہ ہوائی حملوں سے پہلے اس کی پیش بندی کی گئی کہ آبادی کی حفاظت کا اہتمام ہو' نہ ان حملوں کے شروع کرنے کے بعد ایسی زمینی کارروائی کی گئی کہ آبادی کو تحفظ دیا جا سکتا۔ سارا کھیل اس طرح کھیلا گیا کہ سرب فاشی قوتوں کو مسلمانوں کو نکالنے کی پوری مہلت مل جائے اور تاریخ انسانی میں آبادی کی سرعت ترین منتقلی عمل میں آ جائے--- یعنی دو تین ہفتوں میں ایک علاقے کی ۸۰ فی صد آبادی کا انخلا جو ۱۲ لاکھ سے متجاوز ہے!

اس انخلا اور پناہ گزینی کی صعوبتوں کے بعد ناٹو کوسووا کے تباہ شدہ علاقے بلکہ قبرستان اور کھنڈرستان

میں اپنی فوجیں بھیج کر "محفوظ علاقے" بنائے گا اور ان پناہ گاہوں (enclaves) میں تباہ شدہ مسلمانان کوسووا کو دوبارہ آشیانہ بندی کی دعوت دی جائے گی اور یہ کام مغربی این جی اوز اور اسرائیلی ماہرین کے ذریعہ انجام دیا جائے گا۔ یوں بندوبست امن کے نام پر اغلباً روس، جرمنی، قبرص اور یونان کی تحریک پر، لیکن دراصل سربوں بلکہ خود نسل کشی کے مجرم میلاسووچ کی مرضی کے مطابق ملک کی تقسیم کا ایک نیا نقشہ مسلط کر دیا جائے گا تاکہ صدیوں کے بعد مسلمانوں کے ارض بلقان میں ایک بار پھر یکجا ہو کر ایک یا ایک سے زائد مسلم ریاستوں کے قیام کے خواب کو آج ہی نہیں، مستقبل میں بھی شرمندہ تعبیر ہونے کا موقع نہ مل سکے۔ اس بندر بانٹ میں مسلمانوں کو ایسے علاقے دیے جائیں گے جو قدرتی وسائل سے محروم، صنعتی ترقی میں خام اور مواصلات اور سماجی سہولتوں کے باب میں تہی دامن ہوں۔ ان کو سب سے کم ترقی یافتہ علاقوں میں آباد کر کے معاشی، تعلیمی اور مواصلاتی معاملات میں سربوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے گا۔ ان کے ایک فوجی قوت نہ بن پانے کا اہتمام کیا جائے گا اور "حفاظت" اور "صلح کے تحفظ" کے نام پر یورپ (بشمول روس) کی عیسائی اقوام کی مستقل سرپرستی اور تحفظ (protection) کے ذریعے ان کی دائمی محکومی کا بندوبست کیا جائے گا۔ یاد رہے کہ معاہدہ ڈوانتن کی ایک شق یہ بھی ہے کہ بوسنیا ہرزی گووینا سے تمام غیر ملکی مسلم مجاہدوں کو بے دخل کیا جائے گا اور آیندہ مسلمان ممالک کے مجاہدین کے آنے کا کوئی راستہ کھلا نہیں چھوڑا جائے گا: انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تاریخ کا المیہ ہے کہ فلسطین میں مقامی مسلمان اور عرب آبادی کو اپنے وطن سے زبردستی نکالا گیا۔ ۳۰ سے ۴۰ لاکھ فلسطینی دنیا بھر میں بکھیر دیے گئے اور ۳۰ لاکھ یہودی دنیا بھر سے لا کر سرزمین فلسطین کے ان اصل باسیوں کی جگہ ارض فلسطین کے نئے قابض بنا دیے گئے اور اب فلسطینی ایک ایک انچ زمین کے لیے ترس رہے ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر جس کی ۸۵ فی صد آبادی مسلمان ہے اس کے منتخب نمایندوں نے تقسیم ملک سے دو ماہ قبل ۱۷ جولائی ۱۹۴۷ کو باقاعدہ اسمبلی کے ذریعے پاکستان کے ساتھ اپنے الحاق کی قرارداد منظور کی مگر ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ بھارت کی فوج نے محض قوت کے بل پر کشمیر پر قبضے کا خونیں ڈراما رچایا۔ جموں اور کشمیر کے لاکھوں مسلمانوں کو مہاجر بنا دیا اور آج تک ان کو حق خود ارادیت سے محروم رکھا گیا ہے۔

ارض بلقان میں ان دونوں حکمت عملیوں کے امتزاج سے ایک خونیں کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ بوسنیا ہرزی گووینا ہو یا کوسووا، اور کل مقدونیہ ہو (جہاں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ایک تہائی آبادی مسلمان ہے لیکن فی الحقیقت نصف آبادی مسلمان ہے جس میں البانوی الاصل تین چوتھائی ہیں) یا سنجق (SANJAQ) (جہاں ۷۳ فی صد مسلمان ہیں، سب جگہ ایک ہی بنیادی حکمت عملی پر عمل ہو رہا ہے،

ترتیب اجزا اور انداز تنفیذ میں تبدیلیوں کے ساتھ! میلا سووچ اور سرب اصل مجرم ہیں لیکن وہ ساری اقوام بشمول مسلمان حکمران جن کے سامنے یہ سارا کھیل کھیلا جا رہا ہے اور ناٹو (جو دعووں میں بہت تیز اور بلند بانگ مگر عمل کے میدان میں بڑی کوتاہ اور جزرس، بلکہ یہ کہنا بھی خلاف واقعہ نہ ہو گا کہ صرف وہی اقدام کرنے والی جو بالآخر اس عظیم منصوبے کے بروئے کار آنے میں مدد و معاون ہو سکیں) کیسے ذمہ داری سے بری کیے جا سکتے ہیں؟

کوسووا میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ یہی ہے۔ میلا سووچ نے کوسووا کی ۹۲ فی صد مسلمان آبادی اور استصواب میں ان کے ۹۹ فی صد کے باقاعدہ اظہار رائے اور باضابطہ انتخابات کے نتیجے میں رونما ہونے والے صدر اور نمایندوں کے متفقہ اعلان آزادی کو نہ صرف ٹھکرایا بلکہ ان پر ظلم و تشدد کی ایک نہ ختم ہونے والی یلغار کر دی جو ۱۹۹۲ سے آج تک جاری ہے۔ اقوام متحدہ، یورپ، مسلمان ممالک کسی نے بھی بڑھ کر ان کے آزادی کے حق کو تسلیم نہ کیا۔ اب بھی فرانس کی سرزمین پر ناٹو نے جو معاہدہ امن تشکیل دیا ہے اس میں کوسووا کو سربیا کا حصہ رکھا گیا ہے اور کوسووا لبریشن آرمی کو دباؤ کے تحت اس نیم مختاری کے مقام کو قبول کرنے پر مجبور کیا ہے جسے میلاسووچ نے ماننے سے انکار کر دیا۔ اب ناٹو کے اقدام کے بعد برق رفتاری سے، جو پہلے سے طے شدہ منصوبے اور انتظامات کے بغیر ممکن نہ تھی، اس نے اہل کوسووا کو اپنے گھروں سے نکال کر دنیا بھر میں منتشر کر دیا ہے۔ کل اگر کوئی نام نہاد محفوظ علاقے بن بھی جاتے ہیں اور ۵۰ ہزار سے ایک لاکھ مسلمانوں کی شہادت اور ۱۲ لاکھ افراد کے بے گھر اور بے سروسامان ہونے اور اپنی عمر بھر کی پونجی لٹا دینے اور در در کی بھیک مانگنے کے بعد ان مظلوم اور بے بس انسانوں کو اپنے ہی لٹے ہوئے اور جلے ہوئے آشیانے پر واپس بھی لے آیا جاتا ہے تو حاصل کیا ہوا---- چند نام نہاد محفوظ علاقے جو کبھی تاریخی وطن نہ بن سکیں، جن کی مستقل محتاجی بیرونی طاقتوں پر ہو، جو ترقی کے لیے پھر سربوں ہی کی طرف دیکھنے کے کے لیے مجبور ہوں۔ گویا ہمیشہ کے لیے اپنے ہی گھروں میں قید کی زندگی گزارنے کو تیار ہوں! کیا یہ ہے اس تباہی کا حاصل؟ کیا یہ ہے وہ نئی دنیا جسے بنانے کے لیے ناٹو فوجی طاقت استعمال کر رہا ہے اور ان تین ہفتوں میں ۶ بلین ڈالر خرچ کر چکا ہے جبکہ کوسووا کے مسلمان بے گھر بھی ہوئے اور نان جویں کے لیے بھی دوسروں کے آگے بے کسی کا ہاتھ بڑھا رہے ہیں۔

ان حقائق کی پشت پر جو تضادات ہیں ان پر بھی نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے اس لیے کہ ان کی کوئی عقلی تعبیر یا توجیہ بظاہر مشکل نظر آتی ہے۔ عموماً مغرب اپنی وسیع المشربی، رواداری اور جمہوری اقدار کو اپنا مذہب قرار دینے کے لیے مشہور سمجھا جاتا ہے۔ پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ تعدد یعنی pluralism پر ایمان

رکھتا ہے اور ایک سے زائد ثقافتوں اور مذاہب کو بہ یک وقت درست سمجھتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء میں جب اس صدی کا سب سے اہم واقعہ یعنی نظریاتی بنیاد پر پاکستان کا قیام بطور ایک اسلامی ریاست کے ہوتا ہے، تو بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر اسے توڑنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے اور آخرکار جب ۱۹۷۱ء میں یہ ریاست دو حصوں میں بٹ جاتی ہے تب بھی بقیہ ملک کو غیر مستحکم کرنے کے لیے تخریبی قوتوں کی حمایت کی جاتی ہے۔ پاکستان ہی نہیں، الجزائر ہو یا افغانستان، جب بھی سیاسی عمل اور جمہوریت کے ذریعے اسلامی تحریکوں کے برسراقتدار آنے کا کوئی امکان نظر آیا ہے، مغرب کے نام نہاد جمہوریت پرست افراد نے ہمیشہ اسلامی عناصر کا راستہ روکنا چاہا ہے۔ بوسنیا ہرزی گووینا کے مسلمانوں کا واحد جرم یہی تو تھا کہ جب انھیں اپنے مسلمان ہونے کا احساس ہوا تو انھوں نے یورپ میں ایک عادلانہ جمہوری ریاست قائم کرنا چاہی لیکن یورپ نے اپنے تعدد (pluralism) کے بلند بانگ دعووں کے باوجود ایک مسلم ریاست کے قیام کو اپنے لیے خطرہ سمجھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کا ضمیر اپنے کثیر المذہبی سیکولرازم (Secular and Religious Pluralism) کو "مقدس" قرار دینے کے باوجود اپنے مادہ پرستانہ نظام کے مقابلے میں اپنی جغرافیائی حدود میں کسی دوسرے تصور ریاست کو برداشت کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ قرآن کریم نے بالکل درست فرمایا تھا:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۔ آخرکار منکرین نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ یا تو تمھیں ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا ورنہ ہم تمھیں اپنے ملک سے نکال دیں گے (ابراہیم ۱۴:۱۳)۔

اسلامی تحریکوں کی تاریخ گواہ ہے کہ جب کبھی اور جہاں کہیں، نسلیت و عصبیت سے بلند ہو کر توحید خالص کی دعوت پیش کی گئی طاغوت نے یہی کہا کہ یا تو ہمارے رنگ میں رنگ جاؤ، ہوا کے رخ پر چلو، دنیا کے نام نہاد یک قطبی اجارہ داروں سے دوستی و تعلق پیدا کرو، ورنہ تمھیں خود تمھارے اپنے ملک میں اجنبی بنا دیا جائے گا یا ملک سے باہر نکال پھینکا جائے گا۔ انسانی حقوق کی پامالی کے مجرم میلا سووچ کا عقیدہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ فرد جس کو اپنی رگوں میں مسلمان خون ہونے کا احساس ہے، کوسووا میں چھ سو سال رہنے کے باوجود اجنبی البانی ہے! ہاں اگر اس کا خون سفید ہو جائے اور وہ نسلی طور پر سربوں کی افضلیت و فوقیت کو تسلیم کر لے تو اسے دوبارہ انسان کا مرتبہ دیا جا سکتا ہے۔

سرب دہشت گرد میلا سووچ کا یہ فلسفہ دلچسپ ہے کہ تقریباً چھ سو سال سے کوسووا میں بسنے والے مسلمان محض اس بنا پر کہ ان میں سے کچھ کے آبا و اجداد کے خون میں ترک خون شامل تھا اور وہ البانیہ کے راستے یہاں آکر مستقل طور پر آباد ہو گئے تھے، انھیں قیامت تک کوسووا کا باشندہ تسلیم نہیں کیا جائے

گا اور جب چاہے انھیں ملک بدر کر کے ان کی شہریت کو منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس اصول کو درست مان لیا جائے تو جو لوگ اپنے آپ کو امریکی کہتے ہیں فی الحقیقت ان میں سے کوئی بھی امریکی کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ ابھی سوا دو سو سال ہی کی تو بات ہے کہ یہ افراد آئرلینڈ' برطانیہ' فرانس' جرمن' اسپین اور افریقہ کے مسلم علاقوں سے آکر امریکہ میں آباد ہوئے۔ ان سب کے آبا و اجداد کا خون نسلی طور پر خالص نہ تھا۔ کیا صرف اس بنا پر آج تک جتنے صدر اور عوامی نمایندے کانگرس میں منتخب ہوئے غیرامریکی قرار دیے جا سکتے ہیں؟

کوسووا مغرب کی متعصب طاقتوں کے ہاتھوں انسانی حقوق کی پامالی کی بدترین مثال ہے لیکن امت مسلمہ کے لیے اس میں غور کرنے کے کئی اہم پہلو ہیں۔

ہمیں خود احتسابی کر کے یہ دیکھنا چاہیے کہ ۱۹۹۲ سے آج تک سات سال کے عرصے میں جو تحریر دیوار پر صاف نظر آ رہی تھی اور جو صورت حال اتنی خراب ہو چکی تھی کہ گویا بارود میں محض ایک دیا سلائی دکھانے کی دیر ہو' اسے دیکھنے اور سمجھنے کے باوجود ہم نے سات سال کے عرصے میں اپنا فریضہ کس حد تک ادا کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو امت مسلمہ کو ایک جسد واحد بنانا چاہا تھا۔ کیا ہم نے آپ کے ارشاد کی پیروی میں ان مظلوموں کی فکر کی یا انھیں مستضعفین فی الارض بننے دیا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: مومنین کی مثال آپس میں محبت' رحم اور ہمدردی میں ایک جسم کی طرح ہے۔ اگر (اس جسم) کے ایک عضو میں درد ہو تو پورا بدن بے خوابی اور درد کو محسوس کرے گا۔

آج کوسووا جل رہا ہے' لہولہان ہے اور اس کے جسم سے بہنے والا ہر قطرہ احد احد کی آواز کے ساتھ گر کر زمین میں جذب ہو رہا ہے۔ خون کی کثرت نے سطح زمین کی سنگلاخی کو ایک دلدل میں بدل دیا ہے۔ کیا ان گہرے زخموں کی تکلیف کو جو امت مسلمہ کے عضو عضو پر لگے ہیں' ہم حدیث نبویؐ کی روشنی میں اپنے قلب میں محسوس کر رہے ہیں۔ کیا مسلم حکمران اور ادارے اس نازک موقع پر حرکت میں آئے ہیں؟ کیا اس امت مسلمہ نے جو محض ایک شہر گجرات میں پاکستان اور بھارت کے درمیان کرکٹ میچ کے لیے ۲۵ لاکھ کی رقم جمع کر سکتی ہے اور دوبئی میں لہو و لعب کی محفلیں گرم کر سکتی ہے' اس نازک مرحلے پر اس نے اپنے فرض کو محسوس کیا ہے۔ کیا ملک عزیز کی دینی جماعتوں نے اپنا فرض ادا کرنے کی جانب قدم اٹھائے ہیں؟

کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم بزعم خویش یہ سمجھتے رہیں کہ ہم ایٹمی طاقت بھی ہیں اور تعداد کے لحاظ سے بھی دنیا کا پانچواں حصہ ہیں' اس لیے کوئی ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا' جب کہ ہماری اصل کیفیت سمندر کے

جھاگ کی سی ہو۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے: عنقریب اقوام عالم تم پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گی جس طرح کھانے والے دستر خوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ کہا گیا کہ کیا اس روز ہم لوگ تعداد میں بہت تھوڑے ہوں گے، فرمایا نہیں بلکہ تم اس روز تعداد میں بہت زیادہ ہو گے لیکن تمھاری مثال پانی کی سطح پر بہنے والی جھاگ کی طرح ہو گی۔ اللہ تعالیٰ تمھارے دشمنوں کے دلوں سے تمھاری ہیبت نکال دے گا اور تمھارے دلوں میں کمزوری ڈال دے گا۔ پوچھا گیا کہ کمزوری کیا چیز ہے یا رسولؐ اللہ؟ فرمایا: دنیا کی محبت اور موت سے فرار۔

اگر امت مسلمہ کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا تو کیا اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے؟ ان حالات میں اسلام کے علم برداروں کا فریضہ کیا ہے؟ انھیں اپنے حقیقی دشمن کو پہچاننا چاہیے اور عالمی نظام سرمایہ داری کے طاغوت اور استحصالی نظام کو اپنا ہدف بنانا چاہیے۔ معرکہ حق و باطل میں جب شیطانی قوتیں معاشی، سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور ابلاغ عامہ کے ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے امت مسلمہ کے ہر عضو پر ضرب لگا رہی ہوں تو اگرچہ بیانات قراردادوں، مظاہروں اور نعروں کے ذریعے احتجاج کرنا بھی ضروری ہے لیکن مسئلے کے حل کے لیے عملی اور موثر اقدامات کرنا ناگزیر ہے۔ فی الحقیقت ہمیں ایک ایسے ہمہ گیر انقلاب کی ضرورت ہے جو فکر و عمل کو، خاندان کو، معاشرے کو اور آخر کار نظام حیات کے ہر گوشے کو مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی بندگی میں لے آئے۔

میلاسووچ کی شکل میں نسلی عصبیت کا عفریت یورپ کے مسلمانوں کو محض اس بنا پر مٹا دینے کے درپے ہے کہ وہ مسلمان ہیں۔ دوسری طرف مسلمان ممالک میں یہ بولہبی، کہیں ایسے آمروں کی شکل میں اور کہیں ایسے فاشسٹ نظاموں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے جو بظاہر ہمہ وقت جمہوریت کی تسبیح پڑھتے رہتے ہیں لیکن جب چاہیں عوامی جذبات و احساسات اور ملکی مفادات کے خلاف عوام الناس پر جبر و تشدد کرنے، انھیں زد و کوب کرنے، ان پر لاٹھیوں کی بارش اور زہریلی گیس استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ ایسے حالات کوسووا میں ہوں یا اپنے وطن عزیز میں، اسلامی تحریکوں کا لائحہ عمل حسنات اور اچھائیوں سے سیئات اور برائیوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ تحریک اسلامی کی اصل ڈھال صبر اور تقویٰ ہیں اسے جہاں کہیں بھی ابتلا و آزمایش کا سامنا ہوتا ہے اخلاق اور اخلاص عمل ہی اس کا اسلحہ اور فتح و کامرانی کا ذریعہ ہیں۔

کوسووا میں ظلم کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے ان مظلوم بھائیوں اور بہنوں سے اظہار یک جہتی کے لیے ان کی انسانی، مالی، سیاسی اور مادی امداد دل کھول کر کی جائے۔ ایک عام شہری اگر اور کچھ نہیں کر سکتا تو کم از کم ہر سربراہ خاندان یہ تو کر سکتا ہے کہ وہ جو کچھ اپنے خاندان پر ایک ہفتہ میں خرچ کرتا

ہے اس کا نصف یعنی صرف ۳ دن میں ہونے والے خرچ کو اللہ کی راہ میں کوسووا کے مظلوموں کی امداد کے لیے دے دے۔ مدیران جرائد و اخبارات کا فرض ہے کہ اپنے قارئین کو اس مسئلے کی سنگینی سے مطلع کریں' ساتھ وہ اپنے اخبار میں بلامعاوضہ ایسے اشتہار شائع کریں جن میں امداد کی اپیل ہو۔ غیر سرکاری تنظیموں کا فرض ہے کہ وہ طبی اور مادی امداد کی فراہمی کا بندوبست کریں۔ ارباب حکومت کا فرض ہے کہ وہ نہ صرف خود مالی اور مادی امداد فراہم کریں بلکہ قومی ایئر لائن کے ذریعے تمام امدادی سامان مفت بھجوائیں۔ ان قلیل المیعاد اقدامات کے ساتھ ہی اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ کوسووا کے مظلوم مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لیے ایک طویل المیعاد منصوبہ بنایا جائے جس میں تعلیم' تربیت' معاشرت' معیشت' دفاع غرض ہر میدان میں ان کی امداد میں اپنے حصے پر غور کیا جائے۔ اشتراکی آمریت کے دور میں مسلمانوں کو بہت سے شعبوں میں ترقی کے مواقع نہیں ملے اور جب تک ان تمام شعبوں میں وہ قیادت کے مقام تک نہ پہنچیں مسائل کا حل نہیں ہو سکتا۔

یہ درست ہے کہ جہاد بالسیف افضل ترین جہاد ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ تعلیم و تربیت وہ کلید ہے جو شاہراہ ترقی و فلاح تک لے جاتی ہے۔ اسلام ہم سے توازن و عدل کا مطالبہ کرتا ہے جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ عسکری تیاری کے ساتھ ساتھ تعلیم' سائنس' معیشت و معاشرت اور ثقافت ہر میدان میں محنت و کوشش سے علمی و فنی کمال حاصل کیا جائے۔ نہ صرف کوسووا کے لیے بلکہ یورپ میں مسلمانوں کی قیادت کے لیے اس کے بغیر عسکری فتح ناکافی ہو گی۔ اب جب کہ کوسووا کے مسلمانوں کے اندر کا مسلمان جاگ اٹھا ہے اور: ع

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے

تو اسے صحیح انداز میں تعلیم و تربیت کے ذریعے ایسے شاہین میں تبدیل کرنے کی ضرورت ہے جو مغرب کی ذہنی و ثقافتی غلامی سے آزاد ہو کر توحید خالص کی بنیاد پر ایک عادلانہ نظام کے قیام کا ذریعہ بن سکے۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (الرحمن ۵۵)

کھجور کے درختوں میں پھل کس طرح غلافوں میں لپیٹ کر پیدا کیا جاتا ہے۔

اس ایک مثال کو نگاہ میں رکھ کر ذرا دیکھیے کہ

کیلے' انار 'سنترے' ناریل اور دوسرے پھلوں کی پیکنگ میں آرٹ کے کیسے کیسے کمالات دکھائے گئے ہیں۔

یہ طرح طرح کے غلے اور دالیں اور حبوب جو ہم بے فکری کے ساتھ پکا پکا کر کھاتے ہیں ان میں سے ہر ایک کو کیسی کیسی نفیس بالوں اور خوشوں کی شکل میں پیک کر کے اور نازک چھلکوں میں لپیٹ کر پیدا کیا جاتا ہے۔

(تفہیم القرآن' ج۵' ص ۲۵۵)

پس اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے

(خیر خواہ)

عزت کا راستہ

درحقیقت کسی قوم کی اس سے بڑھ کر کوئی ذلت نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنے انسانی حقوق کی پامالی کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرے اور حق مارنے والوں کے ہاتھ میں کوڑا دیکھ کر دم بخود بیٹھ جائے۔

یہ صورت حال جہاں بھی پیدا ہوتی ہے وہاں آدمیت دم توڑنے لگتی ہے اور اس کی جگہ حیوانیت نشوونما پانے لگتی ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ اس حالت کی بہترین تصویر اس مختصر سے فقرے میں کھینچی گئی ہے کہ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَ جَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ج وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ○ (النمل ۲۷: ۳۴) بادشاہ لوگ جب کسی آبادی میں گھس آتے ہیں تو اس کا ستیاناس کر دیتے ہیں اور اس کے ذی عزت لوگوں کو ذلیل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ یہی کچھ ان کے کرتوت ہوا کرتے ہیں۔

جب کوئی قوم خوف اور طمع کی کمزوری میں مبتلا ہو اور عزت کی موت پر ذلت کی زندگی کو ترجیح دینے لگے تو اس پر وہ بلامسلط ہو کر رہتی ہے جو کبھی ملوکیت کی شکل اختیار کرتی ہے اور کبھی آمریت کی۔ پھر وہ آ کر پہلا کام یہ کرتی ہے کہ اس کے اندر شریفانہ اخلاق کی رمق تک باقی نہ رہنے دے اور ہر ممکن طریقے سے اس میں وہ ذلیل سیرت و کردار ابھار دے جو اعلیٰ حضرت کی زبان سے "شب است ایں" کی آواز سنتے ہی "اینک ماہ و پرویں" پکارنے لگے۔ اس کے بعد اس دنائت و سفاہت [کمینہ پن] اور سفلہ پن کے ایسے نمونے سامنے آتے ہیں جنھیں دیکھ کر یہ باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ خالق نے انھیں احسن تقویم پر پیدا کیا تھا۔ اس میں شریف دبتے اور غنڈے ابھرتے ہیں۔ اس میں بدکرداروں کی بن آتی ہے اور نیکی کردار ایک جنس کاسد بن کر رہ جاتی ہے جس کی کہیں نہ قدر و منزلت ہوتی ہے نہ حوصلہ افزائی۔ اس میں خوشامد، چاپلوسی، ضمیر فروشی، چغل خوری، ابن الوقتی، بے ایمانی، خیانت اور حرام خوری کے اوصاف فروغ پاتے ہیں۔ پوری قوم بکاؤ مال کی ایک منڈی بن کر رہ جاتی ہے جس میں مانگ سے رسد بڑھتی چلی جاتی ہے۔ زندگی کا ماحول اس قدر سفلہ پرور ہو جاتا ہے کہ خریدنے والا کسی شرم کے بغیر آدم زاد کو خریدتا ہے، بکنے والا کسی حیا کے بغیر بکتا ہے، ہر طرف سے بکنے والوں پر تحسین و تبریک کی صدائیں بلند ہوتی ہیں، اور نہ بکنے والوں کی حماقت پر ماتم کیا جاتا ہے۔ عدالتوں سے انصاف کے بجائے بے انصافی کی توقع کی جاتی ہے اور وہاں سے انصاف مل جائے تو لوگ اسے خلاف توقع سمجھ کر حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۔ خدمت پیشہ لوگ علم اور شعور رکھنے والے انسان ہونے کے باوجود خدمت لینے والوں کے ہاتھ میں اس طرح بے جان

لاٹھیوں کی مانند کام کرنے لگتے ہیں کہ گویا ان کے اندر روح اور ضمیر نامی کوئی چیز برائے نام بھی موجود نہیں ہے۔ مشرق سے مغرب تک ان میں سے کسی کے اندر [کردار] کی یہ طاقت نظر نہیں آتی کہ دیانت کے خلاف، آئین و قانون کے خلاف اور مفاد ملت کے خلاف کوئی خدمت بجالانے سے صاف انکار کر دے اور اس کا خمیازہ بھگتنے کے لیے تیار ہو جائے۔ بولنے اور لکھنے کی صلاحیتیں خدا نے انسان کو اظہار مافی الضمیر کے لیے دی تھیں، ان کا تعلق ضمیر سے کاٹ دیا جاتا ہے، اور جو کچھ ضمیر میں نہیں ہوتا اس کے اظہار کی خدمت بڑے سستے داموں ان صلاحیتوں سے انجام دی جانے لگتی ہے۔ لوگ دماغ کے بجائے پیٹ سے سوچتے ہیں۔ جذبات دل کی بجائے معدے میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایمان اتنا بے قدر ہو جاتا ہے کہ کوئی قیمت بھی اس کے لیے گراں نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ اس ماحول میں حاملین دین و شریعت تک اس قدر گر جاتے ہیں کہ ان میں سے بعض خوف کی وجہ سے دینی اقدار کی پامالی کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرنے لگتے ہیں اور بعض طمع کی بنا پر خود ان اقدار کے پامال کرنے میں شریک کار بن جاتے ہیں۔ یہی وہ کیفیت ہے جس کو قرآن مجید کی مذکورہ آیت میں "فساد" اور "عزت والوں کی ذلت" قرار دیا گیا ہے۔

اس اسفل السافلین میں جو قوم گر جائے، اس کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ اقوام عالم میں کوئی عزت کا مقام پاسکتی ہے، یا اسے مادی ترقی نصیب ہو سکتی ہے، سراسر ایک غلط خیال ہے۔ تاہم اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ اس کے چرواہے اس کی چراگاہ کو جنت ارضی میں تبدیل کر دیں گے، اور اس کی گردن طوق زریں سے آراستہ فرما دیں گے، اور دنیا کی قومیں اسے سر آنکھوں پر بٹھالیں گی تب بھی میں یہ کہوں گا کہ اس قیمت پر جوہر انسانیت اور شرف آدمیت کی قربانی دینا بڑا مہنگا سودا ہے۔ روح کی موت ہی واقع ہو جائے تو بات دوسری ہے ورنہ مادی خوش حالی کا کوئی بڑے سے بڑا لالچ بھی کسی ذی روح کو اس سودے پر راضی نہیں کر سکتا۔

کسی قوم کی تاریخ میں اگر بدقسمتی سے ایسا کوئی دور آ جائے تو فی الواقع وہ بڑے سخت امتحان کا وقت ہوتا ہے۔ اس حالت کے طاری ہو جانے کے بعد اس کا بدلنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ وہ کبھی بدل نہیں سکتی جب تک اس کو بدلنے کے لیے ایسے لوگ نہ اٹھ کھڑے ہوں جو خوف اور لالچ سے بالاتر ہوں، جنھیں اپنے وقت، اپنی جان، اپنے مال، اپنے ذاتی مفاد اور اپنی آسایشوں کی قربانی دینے میں کوئی تامل نہ ہو، جنھیں نہ خریدا جا سکے اور نہ ڈرایا جا سکے، اور جو اس واضح مقصد کو سامنے رکھ کر ہر خطرہ انگیز کرنے کے لیے تیار ہو جائیں کہ خدا کے بندوں کو بندوں کی بندگی سے آزاد کرانا ہے اور اپنے ملک میں وہ حالات پیدا کرنے ہیں جن میں خدا کا قانون عدل حقیقتاً اور عملاً سب سے بالا ہو کر رہے۔ اس نازک امتحان کی ساعت میں اگر کسی قوم کے اندر چند آدمی بھی ایسے نہ اٹھیں تو پھر اس کے لیے مقدر یہی ہے کہ بے زبان مویشیوں کا ایک گلہ بن کر رہے اور کوئی چرواہا اسے جس طرح چاہے ہانکتا پھرے۔ بلاشبہ ایمان و ضمیر کی آزمایش کوئی

ایسی چیز نہیں ہے کہ آدمی خود اس کو دعوت دے اور غرور نفس کے ساتھ اس میں کود پڑے۔ حقیقت میں تو یہ ہے ہی خدا سے پناہ مانگنے کے قابل چیز، مگر جب وہ پیش آ جائے تو خدا کے بھروسے پر مضبوطی کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ پھر اس سے بھاگنا ویسا ہی گناہ ہے جیسا میدان جہاد سے بھاگنا۔

اب میں چند کلمات دنیاے اسلام کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت پوری اسلامی دنیا کو ایک ہی طرح کے مسائل سے سابقہ درپیش ہے۔ ایک مدت تک مغربی استعمار مسلمان ملکوں پر مسلط رہا۔ اس نے صرف سیاسی حیثیت سے انھیں کچلنے اور معاشی حیثیت سے ان کو غارت کرنے ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ اپنی تعلیم اور تہذیب سے ان کے دین اور اخلاق کی جڑیں بھی کھوکھلی کر دیں۔ پھر سخت قربانیوں کے بعد جب انھیں باہر کے ظالموں سے نجات ملی، تو بہت سے مسلمان ملکوں پر یہ آفت نازل ہوئی کہ ان کے عوام نے اپنا خون بہا کر جو آزادی غیروں سے حاصل کی تھی اسے اپنے ہی گھر کے چند آدمیوں نے چھین لیا۔ اب حال یہ ہے کہ جہاں جن صاحب کو بھی مسند اقتدار پر براجمان ہونے کا موقع مل گیا ہے وہ اس زعم باطل میں مبتلا ہیں کہ "عقل ہے تو ان کے پاس، علم ہے تو ان کے پاس، فلسفی ہیں تو وہ، واضع قانون ہیں تو وہ، دنیا کے حکیم بھی وہی ہیں اور دین کے مرشد و مجتہد بھی وہی، قوم صرف احمقوں پر مشتمل ہے جو اپنے بھلے برے کو ہرگز نہیں سمجھ سکتی۔ اس کی نجات بس اس میں ہے کہ آنکھیں بند کر کے اپنے معاملات ان کے ہاتھ میں چھوڑ دے اور جس ڈگر پر وہ اس کو چلائیں اس پر بے چون و چرا چلتی رہے"۔

یہ برخود غلط لوگ جس ملک پر بھی مسلط ہوئے ہیں، انھوں نے صرف سیاسی اور معاشی اندھیر ہی نہیں مچایا ہے بلکہ دین، اخلاق، تہذیب، قانون، تعلیم، ہر چیز کو ایک بحران عظیم میں مبتلا کر دیا ہے۔ اگر آزادی کے بعد تمام مسلم ممالک میں معروف جمہوری طریقے پر زندگی کا نظام چلتا، تو بہت جلد دنیاے اسلام ایک عظیم متحدہ طاقت بن جاتی۔ کیونکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا دل ایک جیسا ہے، ان کے دماغ ایک ہی طرح سوچتے ہیں اور عمل کے لحاظ سے خواہ کتنا ہی انحطاط ان پر طاری ہو، عقائد و افکار کے لحاظ سے ان سب میں اسلام ہی کی روح جاری و ساری ہے۔ اس لیے اسلام اہل ایمان کو جس وحدت کے رشتے میں باندھتا ہے اس کو نئے سرے سے قائم کر دینا کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ لیکن یہ منزل صرف اس وجہ سے دور ہو گئی ہے کہ بہت سی مسلمان قوموں کو خارجی استعمار سے نجات پانے کے بعد داخلی استبداد سے سابقہ پیش آ گیا ہے۔ اس مرحلے سے جب تک وہ بخیریت گزر نہ جائیں، وہ اپنی آزاد مرضی سے اپنے معاملات چلانے کے قابل نہیں ہیں۔ خداوند کریم سے دعا کیجیے کہ جس طرح وہ مرحلہ اس نے گزار دیا، اسی طرح یہ مرحلہ بھی گزار دے (۲۶ مارچ ۱۹۶۷ کو رہائی کے بعد لاہور کے شہریوں کی طرف سے دیے گئے استقبالیہ سے خطاب، ماہنامہ تجلی دیوبند، مئی ۱۹۶۷، ص ۳۵-۴۰، تدوین: م - س)۔

اسلامک پبلی کیشنز کی خاص پیشکش

امام العصر سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کی سدا بہار تحریروں کا انتخاب

"افکارِ اعلیٰ" سیریز

- دعوتِ دین کی بنیادیں
- عبادت کی حقیقت
- ہماری دعوت کیا ہے
- ایمان اور اطاعت
- مسلمان کی طاقت کا اصل راز
- زندگی کا نصب العین
- اسلام کا تصورِ زندگی
- اسلام کا نظامِ معیشت
- اسلام اور رواداری
- تقدیر کیا ہے
- اسلام کی دعوت
- عبادت کیا ہے
- خلافت کیا ہے
- لباس کیسا ہونا چاہیے
- امر بالمعروف و نہی عن المنکر
- قومیت کا اسلامی تصور
- اسلام کیسا مذہب ہے
- ہدایت و گمراہی کا راز
- اسلام میں عبادت کا تصور
- تعمیرِ سیرت کے اوصاف
- تزکیۂ نفس
- اسلامی نظامِ تعلیم
- قرآن کی معاشی تعلیمات
- نماز ۔ دین کا ستون
- اسلامی انقلاب کے لیے ضروری اوصاف

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳۔ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

فون : 7664504-7669546 فیکس : 7658674 ' e-mail: islamic@ms.net.pk

کلام نبویؐ کی کرنیں

مولانا عبدالمالک

حضرت عبداللہ بن ربیعہؓ مخزومی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے جنگ حنین کے موقع پر ۳۰ یا ۴۰ ہزار درہم ادھار لیے تھے۔ جب آپؐ واپس تشریف لائے تو ادائیگی کر دی اور فرمایا: اللہ تعالیٰ تمھارے گھر اور مال میں برکت عطا فرمائے۔ ادھار کا بدلہ' وعدہ کے مطابق پوری ادائیگی اور شکرگزاری ہے (الفتح الربانی' باب ماجاء فی حسن القضاء کتاب البیوع)۔

اسلام ایک دوسرے کے ساتھ احسان کی تلقین کرتا ہے۔ قرض کا لین دین احسان کی ایک شکل ہے۔ قرض دینے والے کے لیے احسان کا ثواب بھی ہے اور مقروض کی طرف سے بروقت پوری پوری ادائیگی کے علاوہ شکر گزاری کا صلہ بھی۔ جو لوگ قرض لے کر استطاعت کے باوجود بروقت ادا نہیں کرتے یا پوری پوری ادائیگی نہیں کرتے' قرض دینے والے کو تنگ کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں کہ تعلقات خراب ہو جائیں وہ محسن کے احسان کی ناقدری کرنے کے علاوہ احسان کے دروازے کو بند کر دینے اور معاشرے کو خود غرض بنانے کے ذمہ دار ہیں۔

سود اور جوئے کا نظام بھی احسان کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ سود خوری اور جوئے بازی لوگوں میں دولت سمیٹنے کی ایسی حرص پیدا کرتے ہیں کہ وہ کسی کو کچھ دینے کے بجائے لوٹنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

O

حضرت ابو عمران جونیؒ سے روایت ہے کہ مجھے ایک صحابی نے بیان کیا کہ ہم ایران میں جنگ کے لیے جا رہے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ہمیں ہدایات دیتے ہوئے) فرمایا: جو کسی ایسے گھر کی چھت پر رات گزارے جس پر چار دیواری نہیں ہے اور گر کر مر جائے تو اللہ اس کی حفاظت سے بری الذمہ ہے۔ اور جو سمندر میں سفر کرے جب اس میں طغیانی ہو اور ڈوب کر مر جائے تو اس کی حفاظت سے بھی اللہ تعالیٰ بری الذمہ ہے (الفتح الربانی باب وجوب المحافظة علی النفس' کتاب القتل والجنایات)۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر انسان اس بات کا مکلف ہے کہ وہ اپنی جان کی حفاظت کرے۔ حفاظتی اور احتیاطی تدابیر اختیار کرنا شرعی حکم ہے۔ ان تدابیر میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ایسی چھت پر نہ سوئے جس پر چار دیواری

نہیں۔ دریا میں طوفان آیا ہوا ہو تو سمندر میں کشتی یا جہاز نہ چلایا جائے' موسم ٹھیک نہ ہو تو طیارہ نہ اڑایا جائے' سڑک پر سفر ہو تو گاڑی کی رفتار اتنی رکھی جائے جس سے تصادم اور حادثے کو روکا جا سکے۔ کھانے پینے اور علاج معالجے کے سلسلے میں اطبا کی ہدایات پر عمل کیا جائے۔ کسی لڑائی جھگڑے کی بنیاد رکھنا' دوسروں کو گالی دینا' برا بھلا کہنا' ان کے مذہبی اور قومی و ملی جذبات کو مجروح کرنا' ان پر ہاتھ اٹھانا' ان کی تذلیل و تحقیر کرنا جس کے نتیجے میں تصادم برپا ہو' اپنی جان کو نقصان پہنچانے اور تلف کرنے کے اسباب ہیں۔ اس لیے یہ ساری چیزیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ ہدایت کی خلاف ورزی ہیں۔ فرقہ واریت پھیلانا جس کے نتیجے میں قتل و غارت گری ہو وہ بھی اس ہدایت کی رو سے ناجائز ہے۔

O

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک دیوار کے پاس سے گزرے جو جھکی ہوئی تھی (اس کے گرنے کا خطرہ تھا) تو آپؐ اس کے پاس سے تیزی سے چل کر نکل گئے۔ آپؐ سے کہا گیا کہ آپؐ نے اتنی جلدی کیوں کی؟ اس پر آپؐ نے فرمایا: میں اچانک موت کو ناپسند کرتا ہوں (الفتح الربانی' باب وجوب المحافظة علی النفس' کتاب القتل والجنایات)۔

نبی کریمؐ نے زندگی کے ہر شعبے میں جو عملی نمونہ پیش کیا ہے اس کی ایک مثال جان کی حفاظت کے باب میں مذکورہ واقعہ ہے۔ آج کل لوگ بے احتیاطی کو جرأت سمجھتے ہیں۔ کئی لوگ انتہائی تیز ڈرائیونگ کرتے ہیں اور اس کو بہادری سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ بہادری نہیں بلکہ اپنے ساتھ زیادتی اور جان کی حفاظت کے فرض میں کوتاہی برتنا ہے۔ اگر بے احتیاطی کے نتیجے میں انسان ہلاک ہو گیا تو وہ اپنی جان کی ہلاکت کا خود ذمہ دار ہو گا۔ جان کی حفاظت میں جو چیز خلل ڈالے' اسلام نے اسے منع کیا ہے۔ انسانی جان کا شریعت میں بہت زیادہ احترام ہے۔

آج کل خود کشیوں کا جو سلسلہ شروع ہو گیا ہے اس میں ذرائع ابلاغ' ریڈیو' ٹی وی اور اخبارات کا بھی دخل ہے۔ یہ ادارے خود کشیوں کی تشہیر کرتے ہیں جس کے نتیجے میں دوسرے لوگوں کو بھی حالات سے مایوس ہو کر خودکشی کی شہہ ملتی ہے۔ اس طرح کے ادارے خود کشیوں کے گناہ میں شریک ہوں گے۔ اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ کو ان واقعات کی تشہیر میں احتیاط کرنا چاہیے۔ اسی طرح قتل و غارت گری کے واقعات کی تشہیر سے بھی مجرموں کے حوصلے بلند ہوتے ہیں اور ان کو پڑھ کر اور سن کر لوگوں کو قتل و غارت گری اور ڈاکہ زنی کی ترغیب ملتی ہے۔

O

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے (اور مکہ سے مسلمان بھی ہجرت کر کے مدینہ آگئے تو انصار نے انھیں اپنے ہاں جگہ دی' ان کے نان و نفقہ کا انتظام کیا) تو مہاجرین رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسولؐ اللہ! ہم نے انصار کے مال دار لوگوں سے زیادہ خرچ کرنے والا اور غریب لوگوں سے زیادہ ہمدردی کرنے والا کسی کو نہیں پایا۔ ہم ان کے ہاں آئے تو انھوں نے ہمارے اخراجات اپنے ذمے لے لیے۔ کام خود کرتے ہیں اور مال میں ہمیں شریک

کرتے ہیں۔ ہمیں ڈر پیدا ہو گیا ہے کہ سارا اجر یہی لے جائیں گے۔ یہ سن کر آپؐ نے فرمایا: نہیں! جب تک تم انھیں دعائیں دیتے رہو گے اور ان کی قدر دانی کرتے رہو گے' اس وقت تک تم کو بھی اجر ملے گا (ترمذی' ج ۲' ابواب صفۃ القیامۃ)۔

ایمان انسانوں کے درمیان کیسی اخوت اور محبت پیدا کرتا ہے' اس کا نمونہ اس حدیث سے سامنے آتا ہے۔ یہ اخوت و محبت کا بہترین نمونہ ہے۔ انصار کا یہ جذبہ کہ کام وہ کریں لیکن پیداوار میں مہاجرین کو بھی حصہ دیں اور مہاجرین کو اس بات کی فکر کہ اس طرح تو ہم آخرت کے اجر سے محروم ہو جائیں گے۔ مہاجرین میں کام میں شرکت کا جذبہ' بھائیوں کے بوجھ میں ہاتھ بٹانے کا ولولہ جوش مار رہا ہے' جس کی وجہ سے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنے بھائیوں کے لیے دعائیں کرنے' ان کا شکریہ ادا کرنے اور ان کی قدر افزائی کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ دوسری روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ مہاجرین نے کام میں ہاتھ بٹانے کی بات بھی اپنے انصار بھائیوں سے منوالی۔

دوسروں کے ساتھ کام میں ہاتھ بٹائے بغیر نان و نفقہ حاصل کرنا خود داری کے بھی منافی ہے لیکن صحابہ کرام کو اپنی خود داری کے مقابلے میں آخرت زیادہ عزیز تھی۔ اس لیے انھوں نے خودداری کی بنیاد پر آپؐ کے سامنے مسئلہ نہیں رکھا بلکہ اخروی اجر سے محروم ہو جانے کے خطرے کی بنیاد پر گزارشات کیں۔

احسان شناسی انسانی فطرت کا تقاضا ہے' اسلام نے اس پر خصوصی توجہ دی ہے۔ مہاجرین میں اس جذبے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے موقع پر ابھارا کہ ساری عمر انھیں یاد رہا۔

O

حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم سے پہلے زمانے کے لوگوں میں سے ایک آدمی اپنے لباس میں اتراتا ہوا نکلا تھا تو اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا کہ اسے پکڑ لو' زمین نے اسے پکڑ لیا۔ چنانچہ وہ قیامت تک زمین میں دھنستا رہے گا (ترمذی' ابواب صفۃ القیامۃ)۔

جب ایک آدمی یا گروہ تکبر میں ساری حدود پھاند جاتا ہے' وہ کروفر کے متکبرانہ مظاہرے کرتا ہے' اپنی قوت اور طاقت کے نشے میں اللہ کے مدمقابل میں آکر کھڑا ہو جاتا ہے' خلق خدا کو ہیچ سمجھنے لگتا ہے' اہل ایمان کی تحقیر و تذلیل کو اپنا مشن بنالیتا ہے' اپنے آپ کو سپریم سمجھنے لگتا ہے' انا ولا غیری کا نعرہ لگاتا ہے' دنیا کو اپنے تابع فرمان سمجھنے لگتا ہے' تو اللہ تعالیٰ اسے سارے سازوسامان کے ساتھ پکڑ لیتا ہے۔ وہ اپنی زمین کو اسے گرفتار کرنے کا حکم دے دیتا ہے تو پھر زمین اسے پکڑ لیتی ہے اور اس کا سارا لشکر اس کی مدد سے عاجز آ جاتا ہے۔ پہلے کی طرح آج کے متکبرین کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی یہ سنت قائم ہے۔ اہل ایمان کے لیے ان متکبرین کے مقابلے میں اللہ کی مدد کافی ہے: فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ ج وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ (البقرہ ۲:۱۳۷) تمھیں ان کے شر سے بچانے کے لیے اللہ کافی ہے۔ وہی سننے والا اور جاننے والا ہے----- یہی وجہ ہے کہ کفر کس قدر بھی طاقت ور کیوں نہ ہو جائے اہل

ایمان ان سے خوف زدہ ہونے کے بجائے حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ٥ (ال عمرٰن ۳:۱۷۳) اللہ ہمیں کافی ہے اور بہترین کارساز ہے --- کے ورد کو اپنا وظیفہ بناتے ہیں اور ان کے مقابلے میں سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔

O

حضرت عمروؓ بن شعیب اپنے والد سے' وہ اپنے دادا سے بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے روز متکبرین کا حشر ایسے انسانوں کی شکل میں کیا جائے گا جو چھوٹی چھوٹی سرخ چیونٹیوں کی مانند ہوں گے (ذلیل و خوار ہوں گے' لوگ انھیں اپنے پاؤں تلے روندیں گے)' ان پر ہر طرف سے ذلت چھا جائے گی' ان کو جہنم میں' اس قید خانے کی طرف لے جایا جائے گا جس کا نام "بولس" ہے۔ ان کو آگوں کی آگ گھیرے میں لے گی' ان کو پانی کی جگہ جہنمیوں کی پیپ پلائی جائے گی (ترمذی' ابواب صفۃ القیامۃ)۔

اس حدیث میں متکبرین سے وہ لوگ مراد ہیں جو دنیا میں اپنے بڑائی کے نشے میں مبتلا ہو کر اسلام اور مسلمانوں کو کچلنے میں منہمک رہے۔ حشر میں ان کی تذلیل کا نقشہ اس حدیث میں کھینچا گیا ہے۔ وہ ان کے تکبر کی کیسی خفیف سزا ہو گی۔

O

حضرت سعدؓ ابن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آزمائش کن لوگوں پر زیادہ آتی ہے؟ آپ نے فرمایا: انبیا پر۔ پھر درجہ بدرجہ دوسرے لوگوں پر۔ آدمی کو اس کے دین کے لحاظ سے آزمایا جاتا ہے۔ اگر اس کی حالت مضبوط ہو تو اس کی آزمائش زیادہ ہوتی ہے۔ اگر اس کے دین میں کمزوری ہو تو اس پر نرمی کی جاتی ہے۔ اسی اصول پر اسے آزمایا جاتا ہے یہاں تک کہ زمین پر اس طرح چلتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں ہوتا (مشکوٰۃ شریف' بحوالہ ترمذی' ابن ماجہ' دارمی)۔

اہل ایمان کی آزمائش اس امر میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں اور احکام و قوانین پر راضی ہو جاتے ہیں' کس مرتبے پر فائز ہیں۔ یہ آزمایشیں مرتبے کو بھی ظاہر کرتی ہیں اور کفارہ سیئات بن کر درجات کو بھی بلند کرتی ہیں۔

آزمایشیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جن میں انسان کے ارادہ و عمل کو دخل نہیں ہوتا' جیسے فقر و فاقہ' بیماری' مال اور اولاد وغیرہ کے سلسلے میں آفات سماوی۔ دوسری وہ جو کسی مومن کو ایمان و دعوت کی راہ میں کفار و فساق کی طرف سے پیش آتی ہیں۔ ان دونوں قسم کی آزمائش میں اللہ کے فیصلوں پر راضی رہنا اور کفار اور ظالم و جابر حکمرانوں کی طرف سے مصائب و مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے آگے بڑھنا ہی کامیابی ہے۔ مومن کی نظر آخرت پر ہوتی ہے۔ دنیا کی یہ تکلیفیں' اخروی راحتوں میں تبدیل ہو جائیں گی۔ کفر و فسق کے ساتھ مجموعہ کے عیش و راحت حاصل کرنا' درحقیقت ذلت و رسوائی ہے' اور ایمان کے ساتھ تکلیف اٹھانا حقیقی عزت و شان ہے۔ راہ حق میں مصائب برداشت کرنا' انبیائے کرام کا اسوہ ہے۔

یہ احترام اللہ اللہ!

شاہ بلیغ الدین

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے لیے تشریف لائے تو مکہ اور اطراف مکہ کے نہ جانے کتنے لوگوں نے آپؐ کو دیکھا۔ ظالموں پر آپؐ کی مہربانیاں دیکھیں۔ کٹر دشمنوں سے محبت کا سلوک دیکھا۔ خدا کے گھر کو خدا کا گھر بنتے دیکھا۔ ایک دنیا اُسی وقت ایمان لے آئی۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کے دل میں یہ چنگاری تو اسی وقت سلگ اٹھی لیکن کچھ مصلحتیں تھیں کہ انتظار کی گھڑیاں گنتے رہے۔ انھی میں عبدالعزیٰ بھی تھے--- یتیم!

چچا نے پرورش کی۔ بڑے ہوئے تو چچا نے ایک غلام' کچھ بکریاں اور کچھ اونٹ دیے۔ بھتیجے کو اتنا کچھ دے دیا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے۔ ہوشیار بھتیجے نے اپنی محنت سے کاروبار کو خوب پھیلایا اور اپنے قبیلے مزینہ میں بڑا نام پیدا کیا۔ یوں عبدالعزیٰ کی دنیا تو سنبھل گئی لیکن آخرت کے سنورنے کا کوئی سامان پیدا نہ ہوا۔ چچا بت پرست اور بڑا پکا بت پرست۔ حد یہ کہ فتح مکہ کے بعد اسلام کا ایک سے ایک بڑا دشمن ایمان لے آیا لیکن اس کے دل پر مہریں ہی لگی رہیں۔ بھتیجے نے سوچا تھا شاید فتح مکہ کے بعد میرے چچا کا دل پھر جائے گا لیکن ایسا نہ ہوا۔ آخر ایک دن بھتیجا چچا کے پاس پہنچا۔ بہت سوچ بچار کے بعد طے کر لیا کہ کیا کرنا ہے اور بولا: برسوں اس انتظار میں گزر گئے کہ کبھی تو آپ بت پرستی سے توبہ کر لیں گے اور خدا کو ایک مان لیں گے لیکن ابھی تک وہ وقت نہیں آیا۔

چچا نے کہا: تو پھر!

جواب ملا: پھر یہ کہ مجھے اجازت دیجیے۔ زندگی کا کیا بھروسا! آج ہے کل نہیں۔ میں تو اب مسلمان ہو جانا چاہتا ہوں۔

چچا کے تیور بگڑے۔ جس نے پالا پوسا' بڑا کیا' زندگی بنائی' اب اُسے سبق پڑھایا جا رہا تھا۔ یہ سوچ کر چچا کا غصہ اور بھی بھڑکا۔ تپاک سے بولا: یہ تیرے کپڑے' تیرے رہنے کے مکان' سب سازوسامان میرا ہے۔ ایک ایک چیز جو تیرے پاس ہے میری دی ہوئی ہے۔ اچھی طرح سوچ لے اس میں سے ایک چیز بھی

تیرے پاس نہ رہے گی۔ بیٹا! باپ دادا کے مذہب کو چھوڑنا ہنسی کھیل نہیں۔

جواب ملا: بالکل سچ! ہر چیز آپ کی ہے' آپ کی نذر ہے' مجھے کچھ نہیں چاہیے ؎

بت خانۂ چیں ہو گر تیرا گھر   مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

اب جو یہ اللہ کا بندہ چچا کے پاس سے اٹھا تو اس کی ایک ایک چیز لوٹا دی حتیٰ کہ جسم کے کپڑے بھی۔ ماں کے پاس اس حال میں آیا کہ ماں نے دیکھا تو چونکیں۔ بیٹے نے کہا: ایک کپڑے کی ضرورت ہے' دے دیجیے۔

ماں نے حیرت سے پوچھا: بات کیا ہے؟ بولے' میرا دل پلٹ گیا ہے۔ اب بت پرستی نہیں ہوتی۔ میں تو مدینہ جاؤں گا' ایمان لے آؤں گا۔ ماں نے ایک کمبل دے دیا۔ اسے پھاڑ کر دو ٹکڑے کیے۔ ایک کا تہ بند بنالیا' ایک جسم پر ڈال لیا اور مدینہ کی راہ لی۔

زندگی کے اتنے دن اور اتنی راتیں کفر کے اندھیارے میں گزری تھیں۔ اس کا بڑا افسوس تھا۔ مدینہ پہنچ کر مسجد نبویؐ میں قدم رکھا تو اللہ کے فضل سے شب کی سیاہی چھٹ رہی تھی اور پو پھٹ رہی تھی۔ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ انتظار کی چند گھڑیاں رہ گئی تھیں لیکن انھیں گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز پڑھ کر تشریف فرما ہوئے تو دربار نبویؐ سجا۔ آپؐ نے ملاحظہ فرمایا کہ حاضرباشوں میں ایک اجنبی بھی موجود ہے۔ کمبل کے دو ٹکڑوں سے جسم کو ڈھانپ رکھا ہے۔ دریافت فرمایا: کون ہو؟

اجنبی نے عرض کیا: مسافر ہوں۔ عبدالعزیٰ میرا نام ہے۔ سلام کی نیت سے حاضر ہوا تھا۔ شکر ہے کہ آپؐ کو نماز پڑھتے دیکھنے کی سعادت بھی حاصل ہو گئی۔

ارشاد ہوا: آج سے تمھارا نام عبداللہ ہے اور ذوالبجادین لقب! "ذوالبجادین" یعنی دو کپڑوں والا! پھر ارشاد ہوا: میرے دروازے پر رہا کرو۔ حضرت عبداللہؓ اصحاب صفہ میں شریک ہو گئے۔ صفہ چبوترے کو کہتے ہیں۔ مسجد نبویؐ کے ایک طرف ایک چبوترہ تھا جہاں اہل ایمان پڑھتے لکھتے اور ذکر و عبادت میں مصروف رہتے۔ ان کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی۔ کل تعداد ۴۰۰ تک پہنچی تھی لیکن ایک وقت میں کبھی یہ تعداد نہیں ہوئی تھی۔

حضرت عبداللہؓ کی زندگی کے یہ دن بڑے ذوق و شوق اور جذب و مستی کے دن تھے۔ یہی زمانہ تھا کہ تبوک کی لڑائی کے لیے تیاریاں ہونے لگیں۔ یہ بھی خدمت نبویؐ میں پہنچے۔ عرض کیا یارسولؐ اللہ! دعا فرمایئے کہ میں راہ خدا میں شہید ہو جاؤں۔ ابھی ایمان لائے دن ہی کتنے ہوئے تھے! لیکن جہاد کے نام پر آگے آگے تھے۔ یہی تو وہ مقام ہے جہاں ایمان کا امتحان ہوتا ہے۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ج

(النساء ۴: ۷۶) جو پکا ایمان رکھتے ہیں وہ تو اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں۔

ان کے جذبۂ سرفروشی کو دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جاؤ کسی درخت سے تھوڑی چھال اتار لاؤ! عبداللہؓ دوڑے دوڑے گئے اور چھال کا ایک ٹکڑا لے آئے۔ آپؐ نے وہ چھلکا ان کے بازو پر باندھ دیا اور فرمایا: خداوندا! میں کافروں پر اس کا خون حرام کرتا ہوں! ذوالبجادین نے سنا تو اپنی قسمت پر آنسو بہانے لگے۔ بولے: افسوس کہ دل کی تمنا دل ہی دل میں رہی جاتی ہے!

ارشاد ہوا کہ مسلمان جہاد کی نیت سے نکلے اور بیماری سے مرجائے تو ایسے میں بھی اسے اللہ شہادت کا درجہ نصیب کرتا ہے۔

حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا کیا مطلب تھا، تبوک پہنچ کر معلوم ہوا۔ اسلامی لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ لڑائی کے کوئی آثار نہ تھے۔ شہادت کی حسرتیں دل کی دل میں رہ گئیں۔ مسلمان لوٹنے والے تھے کہ یکایک حضرت عبداللہؓ بیمار پڑے--- ایسے سخت کہ دیکھتے ہی دیکھتے چٹاپٹ ہو گئے۔ ایمان لانے کے بعد پہلا ہی جہاد تھا۔ بغیر لڑے خدا نے آپ کو شہادت کا درجہ عطا فرمایا۔

حضرت بلال حارثؓ مزنی نے ذوالبجادین کے دفن کا حال دیکھا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ رات کا وقت تھا۔ حضرت بلالؓ کے ہاتھ میں چراغ تھا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ان کی میت کو قبر میں اتار رہے تھے۔ سرور کونینؐ بنفس نفیس قبر میں اترے اور ارشاد فرمایا: اپنے بھائی کا پورا احترام کرو! حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ہاتھوں سے ان کا منہ قبلے کی طرف کیا اور باہر نکل کر دعا فرمائی۔ صحابہ کرامؓ نے سنا۔ ارشاد نبویؐ تھا کہ الٰہی آج کی شام تک میں اس سے خوش رہا ہوں تو بھی اس سے راضی ہو جا۔ پھر آپؐ نے اُن کی قبر پر اینٹیں رکھیں----- یہ نصیب، اللہ اکبر! یہ اللہ کی دین ہے، جسے چاہے سرفراز کرے۔ ایک حضرت عمروؓ بن وقش تھے۔ سیدھے میدان احد میں آئے، کلمہ پڑھا، تلوار سونتی، میدان میں کود پڑے اور بے جگری سے لڑتے ہوئے اللہ کو پیارے ہوئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا: عمل تھوڑا کیا لیکن صلہ بہت پایا۔ یہی کچھ حال حضرت عبداللہؓ ذوالبجادین کا بھی تھا (زیر اشاعت کتاب بزم الف لام میم کا ایک باب)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

میں نے جہنم کی آگ سے زیادہ خطرناک چیز کوئی نہیں دیکھی کہ جس سے بھاگنے والا سو رہا ہے۔ اور جنت سے زیادہ عمدہ چیز نہیں دیکھی کہ جس کا چاہنے والا سو رہا ہے۔ (ترمذی)



استبدادی طرز حکومت

عبدالحمید صدیقی

۲۱ فروری ۱۹۹۹ کو لاہور میں جماعت اسلامی کے دفتر میں منعقدہ پرامن اجتماع پر پولیس نے جس وحشیانہ انداز سے شیلنگ اور لاٹھی چارج کیا' اور توہین و تذلیل کے لیے جو طریقے اختیار کیے' اسے مدیر نوائے وقت نے جلیاں والہ باغ سے تعبیر کیا (ہفت روزہ تکبیر ۸ / اپریل ۱۹۹۹)۔ اس موقع پر ہم جلیاں والہ باغ کے حوالے سے سابق مدیر ترجمان القرآن کی ایک تحریر کے کچھ حصے مربوط کر کے پیش کر رہے ہیں۔ (مدیر)

حکومت کی سب سے خوفناک قسم وہ ہے جس کا خمیر شہنشاہیت اور استعماریت سے اٹھایا گیا ہے۔ یہ حکومت کسی ایک فرد' خاندان یا کسی استعمار پسند قوم کی کبریائی قائم کرنے کے لیے معرض وجود میں آتی ہے۔ اس حکومت کا مقصد وجود بندگان خدا کی خدمت کرنا نہیں ہوتا بلکہ انھیں تباہ و برباد کرنا ہوتا ہے۔ جبر و استبداد' سفاکی اور زیردست آزاری اس حکومت کے راہنما اصول ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے نہایت گھٹیا اور ذلیل قسم کے ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے اس امر کی کوشش کی جاتی ہے کہ قوم کے اندر سے ایسے کمزور سیرت و کردار رکھنے والے لوگوں کو تلاش کیا جائے' جو محض اقتدار کی رضا جوئی کے لیے اپنے بھائی بندوں کا گلا گھونٹنے سے بھی دریغ نہ کریں۔ اس طرح قوم کی گردن پر ایک ایسا طبقہ مسلط ہو جاتا ہے جو اس کے مفادات کا دشمن اور بدخواہ اور اس کے خون کے پیاسوں کا دل و جان سے ہمدرد اور خیرخواہ ہوتا ہے۔ پھر اس طبقے کی پوری قوت و طاقت کے ساتھ پشت پناہی کی جاتی ہے تاکہ اس کے ناپاک عزائم میں کوئی اضمحلال نہ پیدا ہونے پائے۔

دوسرے' اس امر کا بھی پورا پورا اہتمام کیا جاتا ہے کہ قوم سیاسی اعتبار سے بالکل مفلوج رہے۔ چنانچہ جب بھی اس کے اندر سیاسی بیداری کی کوئی لہر ابھرتی ہے تو اسے پوری قوت کے ساتھ دبا دیا جاتا ہے۔ اسے ہمیشہ اس بات کی تلقین کی جاتی ہے کہ وہ جانوروں کی طرح کسی شعور و احساس کے بغیر مسلسل کام کرتی رہے' عالم بالا سے جو احکام صادر ہوں انھیں بلاچون و چرا بجالاتی رہے اور برسراقتدار طبقے کے کسی

قول یا عمل پر کوئی حرف گیری نہ کرے اور اسے اس امر کی پوری پوری اجازت دے کہ وہ اپنی منشا اور مرضی کے مطابق جس طرح چاہے، جونک کی طرح اس کا لہو چوستا رہے۔

یہ مقاصد جتنے ناپاک ہیں اتنے ہی ناپاک ذرائع سے ان کا حصول ممکن ہے۔ چنانچہ آپ جب بھی استعمار پسندوں کی ذہنیت کا تجزیہ کریں گے تو آپ کو اس کے پیچھے بجز تکبر، نخوت، حرص و ہوا کی پرستش، بے ضمیری، بے حسی اور مردم آزاری کے اور کوئی چیز نہ ملے گی۔ تاریخ انسانی میں اس بیمار ذہنیت کے بے شمار نمونے ملتے ہیں۔

جب بھی اس قسم کی بیمار ذہنیت والے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار کی باگیں آتی ہیں تو وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ان کی کسی حرکت سے مخلوق خدا کا کتنا بھاری نقصان ہوتا ہے۔ انھیں ہمیشہ اس بات کی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ کوئی شخص بھی ان کے کسی حکم سے سرتابی کرنے کی جسارت نہ کرے۔ وہ جس قسم کے ظالمانہ احکام صادر کرتے رہیں، لوگ بلاادنیٰ تامل انھیں بجالاتے رہیں۔

اس قسم کے لوگوں کا ظرف بڑا چھوٹا ہوتا ہے۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور معمولی معمولی اختلافات پر نہایت ہی گھناؤنے مظالم کا ارتکاب کرنے سے نہیں چوکتے۔ کسی معاملے کے حسن و قبح پر سنجیدگی سے غور کرنا ان کے بس کا کام نہیں ہوتا۔ ان کی اشتعال گیر طبیعت ہمیشہ اس امر کی خواہاں رہتی ہے کہ اسے بھڑکنے کو کوئی ادنیٰ سا موقع ہاتھ آئے تاکہ وہ قہرمانیوں کا مظاہرہ کر کے اپنے نفس کی تسکین کا سامان فراہم کر سکے۔

اس ہوس پرستانہ ذہنیت کا یہ بھی ایک خاصہ ہے کہ اسے اپنی صحیح حدود کا احساس نہیں رہتا جس کی وجہ سے اس کے اندر انا ولا غیری کا غلط جذبہ پرورش پاتا ہے۔ چنانچہ اس کے اندر آمریت اور خود پسندی کے نہایت خطرناک رجحانات ابھرنے لگتے ہیں۔ ایسے افراد اپنے ہر فیصلے کو قطعی، حتمی اور ہر خطا سے پاک اور منزہ سمجھنے لگتے ہیں، غیر مسئول اقتدار کی چاٹ آہستہ آہستہ ان کے اندر اس باطل خیال کی آبیاری کرتی ہے کہ ان کا ہر حکم عدل و انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہے اور اس سے ہٹ کر جو دوسری صورت بھی اختیار کی جائے وہ لازمی طور پر حماقت اور بے وقوفی ہے۔

شیطنت جب اقتدار کا تخت سنبھالتی ہے تو اس میں غرور اور تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور نخوت اور خود پسندی کے جراثیم حیرت انگیز سرعت کے ساتھ پرورش پاتے ہیں۔ وہ لطیف احساسات سے عاری ہو کر انسانوں کے ساتھ اس طرح معاملہ کرتی ہے کہ جو مسائل صرف تلقین و ترغیب کی وجہ سے بڑی آسانی کے ساتھ حل کیے جا سکتے ہوں، ان میں بھی انتہائی سختی کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے تاکہ لوگوں کے حوصلے بالکل ٹوٹ جائیں اور وہ اپنی قومی امنگوں اور تمناؤں کے خود اپنے ہاتھ سے مدفن تیار کر کے ان پر مجاوروں کی طرح یادوں کے دیے جلانے میں مصروف رہیں اور اس طرح آنے والی نسلوں کے عزائم کی قوت اور

حوصلوں کی بلندی عطا کرنے کے بجائے مایوسیوں اور ناکامیوں کی تصاویر فراہم کر دیں۔

چنانچہ تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ جب بھی شیطان نے اقتدار کا تخت بچھایا ہے تو اس نے چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں سے تو نرمی برتنا گوارا کیا ہے، لیکن ان لوگوں کو کبھی معاف نہیں کیا، جو اپنے ضمیر اور ایمان کو اس کے پاس رہن رکھنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اس نے ہمیشہ اس قسم کے "باغی" لوگوں کی اس بے دردی سے خبر لی ہے کہ پوری قوم دہشت زدہ ہو کر بیٹھ گئی اور اقتدار نے پھر بالکل بے لگام ہو کر لوگوں کو اپنی ہوس کاریوں کا نشانہ بنایا۔

آپ اگر استعماریت کے ظالمانہ ہتھکنڈوں کا دقتِ نظر سے مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس سامانِ عبرت کی فراہمی ہی سے استعمار کچھ دیر تک عوام کی گردنوں پر مسلط رہنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اس ناپاک مقصد کے حصول کے لیے معصوم لوگوں کو خاک و خون میں تڑپانے پر ہی اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ ضمیر و احساس کے ان سارے سوتوں کو بند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جن سے اختلاف کی لہریں پیدا ہونے کا کوئی امکان بھی موجود ہو۔

اس مقصد کے لیے سب سے زبردست حملہ معصوم انسانوں کے ضمیر اور ان کی عزتِ نفس پر کیا جاتا ہے تاکہ وہ بالکل مضمحل ہو کر بیٹھ جائیں۔ جنرل ڈائر نے اس سلسلے میں جو مختلف حربے استعمال کیے، ان میں پہلا حربہ یہ تھا کہ مجرم و معصوم کی تمیز کے بغیر جو کوئی ہاتھ لگتا اسے بالکل برہنہ کر کے سربازار کوڑے لگائے جاتے۔ اس کے علاوہ اس ظالم نے ایک خاص محلے میں، جس میں اس کے قول کے مطابق "ایک انگریز عورت کی توہین کی گئی تھی" ایک چبوترہ بنوایا اور امرتسر کے چند شرفا کو جنھوں نے پولیس کی ظالمانہ کارروائیوں میں اس کا شریک بننے سے انکار کر دیا تھا، اس پر کھڑا کر کے ان کی بڑے وحشت ناک طریق سے پٹائی کروائی تاکہ وہ دوسرے "گستاخ لوگوں" کے لیے سامانِ عبرت بن سکیں۔

پھر اس محلے کے متعلق یہ حکم بھی دیا گیا کہ جس شخص کو بھی اس طرف سے گزرنا ہو، وہ سیدھا چل کر نہیں بلکہ رینگ کر اس فاصلے کو طے کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ پورے شہر میں اس امر کا اعلان کیا گیا کہ "جہاں کہیں بھی کوئی سفید فام نظر آئے اسے فوجی آداب کے تحت سلام کر کے اپنی نیاز مندی کا مظاہرہ کیا جائے"۔ اس ضمن میں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ان احکام سے عوام کو پوری طرح آگاہ کرنے سے پیشتر ہی گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور پولیس اور فوج نے لوگوں کے دل و دماغ پر حکامِ وقت کی ہیبت بٹھانے کے لیے ان کی بے تحاشا مرمت کی۔

ممکن ہے ایک سطح بین انسان ان سزاؤں کو اتنا لرزہ خیز نہ سمجھے، جتنا کہ پھانسی یا قتل کو عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو انسانی نفسیات سے معمولی واقفیت بھی رکھتے ہیں، وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس قسم کی سزاؤں سے انسان کی عزتِ نفس کو ناقابلِ تلافی صدمہ پہنچتا ہے۔ ان سے اس کی خودی

کی موت واقع ہوتی اور ان کی اذیت جھیلنے کے بعد وہ بسااوقات انسانیت کے سارے قیمتی احساسات اور جذبات کھو بیٹھتا ہے اور آب و گل کا ایک متحرک پیکر بن جاتا ہے۔

آپ اگر جرم و سزا کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ دنیا کے غیرت مند انسانوں کو جب ظلم و استبداد نے تختہ دار پر لٹکایا تو انھوں نے بڑی جرات مندی کے ساتھ جان کی بازی لگا دی، لیکن جب ان کی عزت نفس کو مجروح کرنے کے لیے کوئی اقدام اٹھایا گیا تو وہ اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ دماغی توازن تک کھو بیٹھے۔

ایک شریف انسان کے لیے اپنی زندگی سے کہیں زیادہ اپنی عزت عزیز ہوتی ہے۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا سکتا ہے، لیکن کسی ایسے وار کو برداشت نہیں کر سکتا، جس میں اس کے نفس کی تذلیل مقصود ہو۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی حکومت جتنی اخلاقی اعتبار سے کمزور ہوتی ہے، اتنی ہی وہ شرفا کی تذلیل کا سامان فراہم کرتی ہے تاکہ یہ لوگ خوفزدہ ہو کر لب کشائی کی جرأت نہ کریں۔

کسی قوم کے ضمیر کو مردہ کرنے، اس کی امنگوں اور آرزوؤں کو برباد کرنے، اس کے عزم و ارادہ کو مضمحل کرنے اور اس کے اندر جرأت مندی اور حریت کے جذبات کو کچلنے کے لیے دار و رسن کی سزا کبھی بھی موثر نہیں ہوتی۔ اس سے ذوق جنوں بڑھتا ہے۔ یہ ناپاک مقاصد خودی کی موت سے ہی حاصل کیے جاتے ہیں۔ اس لیے استعمار اور شہنشاہیت نے ہمیشہ اس کی موت کا سامان کیا۔

استبداد کی ان دونوں قوتوں کو اس امر کا شدید احساس رہتا ہے کہ اگر عقل و شعور کو مفلوج نہ کیا جائے تو عوام ذہنی غلامی قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے اور وہ حکمرانوں کے طرز فکر سے ہٹ کر سوچنے کی جسارت کر بیٹھتے ہیں۔ اسی طرح اگر ان کے ضمیر میں زندگی کی کوئی رمق موجود ہو تو وہ ظلم و استبداد کا نہ تو آلہ کار بننے پر رضامند ہوتے ہیں اور نہ اسے خاموشی سے برداشت کر سکتے ہیں۔ ان کی زبانوں سے کبھی کبھی حرف شکایت نکل ہی جاتا ہے۔ ان کے اندر جب تک عزت نفس کا کوئی احساس باقی ہے تو ان کے لیے یہ بات ناممکن ہے کہ وہ اپنی اور اپنے بھائی بندوں کی تذلیل پر مسرت و شادمانی کا اظہار کریں اور ظالموں کا ہاتھ روکنے، یا زبان سے ان کی ریشہ دوانیوں کی مذمت کرنے کے بجائے دل و جان سے ان کی تائید کریں۔

اس بنا پر استبداد اس وقت تک کبھی بھی مطمئن نہیں ہوتا، جب تک کہ اسے اس بات کا پوری طرح یقین نہ ہو جائے کہ ملک کی بہت بڑی اکثریت کو یا تو شعوری پستی نے انسانوں کے زمرہ سے نکال کر حیوانوں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے، یا زینت حیات دنیا کی چمک نے اس کی نظروں کو اس حد تک خیرہ کر دیا ہے کہ وہ ان لرزہ خیز مظالم کو دیکھنے سے قاصر ہیں جو ہر وقت ان کے سامنے ہوتے رہتے ہیں، یا اس کے ضمیر اس حد تک مردہ ہو چکے ہوں کہ بڑے سے بڑا ظلم اور شدید سے شدید ناانصافی بھی اس کے اندر نفرت و

حقارت کی کوئی تحریک پیدا نہیں کر سکتی۔

یہ ذہن نشین رہے کہ جنرل ڈائر کوئی منفرد شخصیت نہ تھی، جس نے محض وقتی جوش میں آکر یہ سارے مظالم ڈھائے۔ ڈائر کے پورے طرز عمل میں ایک جابرانہ نظام کی روح کار فرما ہے، جس کا وہ محافظ اور پاسبان ہے۔ دنیا میں جب کبھی بھی اقتدار کے تخت پر ایسے لوگ متمکن ہوئے، جو اس تمکنت کے لیے کوئی اخلاقی جواز نہ رکھتے تھے تو انھوں نے ہمیشہ اس ظالم جرنیل کا سا رویہ اختیار کیا۔

ڈائر دراصل ایک ذہنیت ہے جو ہمیں ماضی اور حال کے بے شمار حکمرانوں کے اندر جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اس ذہنیت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ حکومت اور فرمانروائی کے لیے قریب قریب وہی ہتھکنڈے استعمال کرتی ہے، جو جنرل ڈائر نے کیے تھے۔ ان ہتھکنڈوں کو استعمال کیے بغیر وہ اپنے ناپاک مقاصد کو کبھی حاصل نہیں کر سکتی۔

آپ اگر ان لوگوں کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ لوگ ہمیشہ سستی شہرت حاصل کرنے کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور پولیس اور فوج کے ذریعے لوگوں پر اپنی ہیبت طاری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھیں ہمیشہ یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ اخبارات میں نمایاں تصاویر کے ساتھ ان کے ہر قول اور فعل کی تشہیر ہو، ملکی پریس ان کے غیر معمولی تدبر اور ذہانت کا ڈھنڈورا پیٹے۔ ان کی خدمت میں لمبے چوڑے سپاس نامے پیش کیے جائیں اور قوم ان کے ناجائز تسلط اور ان کی ریشہ دوانیوں کو یکسر نظرانداز کر کے انھیں نجات دہندہ تسلیم کرنے لگے۔ یہ حضرات لوگوں کو ہر آن یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ دراز دستیاں اور ستم رانیاں عوام کی بہتری اور بھلائی کے لیے ناگزیر ہیں۔ اس لیے وہ بالکل بادل ناخواستہ ایسا کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں اور وہ یہ سب کچھ قوم کی فلاح و بہبود کے لیے کر رہے ہیں۔ اس میں ان کی کوئی ذاتی غرض کار فرما نہیں۔

حکومت و فرمانروائی کی کئی قسمیں ہیں: اس کی سب سے اعلیٰ و ارفع قسم وہ ہے جسے قرآن مجید نے خلافت سے تعبیر کیا ہے، یعنی وہ اجتماعی ہیئت جس کا واحد نصب العین ان مقاصد کی تکمیل ہے، جو انبیا علیہم السلام لے کر دنیا میں تشریف لائے اور جنھیں ختم الرسل محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے کمال کے ساتھ عملی زندگی میں نافذ کر کے نوع بشر کے لیے قیامت تک ایک نمونہ فراہم کر دیا۔

یہ خلافت ایک ایسا نظم اجتماعی ہے جس کے منشا، مقصد اور نوعیت کو علم سیاست کی کوئی قدیم و جدید اصطلاح کماحقہ بیان کرنے سے قاصر ہے۔ یہ حکومت و فرمانروائی نہیں بلکہ خدمت اور چاکری ہے۔ یہ کوئی قوت قاہرہ نہیں، بلکہ نیکی اور بھلائی کی طاقت ہے۔ یہ قوم، ملک اور اس کے خزانوں پر کوئی غیر مسئول اقتدار نہیں، بلکہ امانت کا ایک ایسا بار گراں ہے، جو خدا کا کوئی اطاعت گزار بندہ بڑے خوف کے ساتھ

اٹھانے پر آمادہ ہوتا ہے۔ اپنی کبریائی کے ٹھاٹھ قائم کرنے کے لیے اس کی آرزو اور تمنا نہیں کی جاتی۔
یہ بوجھ جب کسی شخص پر اس کی اہلیت کی وجہ سے لاد دیا جاتا ہے تو وہ قوت کے اس سرچشمے کو، ان بھلائیوں کو فروغ دینے کے لیے اس سے مدد لیتا ہے، جنھیں طاغوت اس دنیا سے نیست و نابود کرنے کا آرزومند ہے۔ جن مقدس ہستیوں نے اس بار کو پورے شعور اور احساس ذمہ داری کے ساتھ اٹھایا، انھوں نے اپنے ذاتی آرام و آسایش کو بالکل تیاگ دیا۔ اس کی ذمہ داریوں کے تصور سے وہ کانپ جایا کرتے تھے اور اپنے خالق اور مالک کے حضور میں بڑے سوز کے ساتھ اس قسم کی دعائیں کیا کرتے تھے:

بارالٰہا! مجھ پر بڑھاپا طاری ہو گیا ہے، میری ہڈیاں چٹخنے لگ گئیں، میری قوت جواب دینے لگی ہے، میری رعایا بہت پھیل گئی ہے، بس اب تو مجھے اپنے پاس اس حال میں بلا لے کہ نہ میں نااہل قرار پاؤں اور نہ ملامت کا سزاوار ٹھیروں (حدیث نبویؐ) (مکمل مضمون کے لیے مصنف کی کتاب: انسانیت کی تلاش میں ملاحظہ کیجیے۔ ناشر: حرا پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور)۔

دعوت اسلامی کی نئی جہتیں

خرم مراد

اجتماعی تحریکیں جن عظیم الشان مقاصد کو اپنا نصب العین بنا کر اٹھتی ہیں' طویل عرصہ گزر جانے کے بعد ان مقاصد کا شعور کبھی کبھی دھندلا بھی جاتا ہے۔ وقتی اور ہنگامی نوعیت کی سرگرمیاں' وسائل اور وقت کا زیادہ حصہ اپنے لیے صرف کرنے پر مجبور سا کر دیتی ہیں۔
اس فطری مجبوری کے باوجود یہ ضروری ہے کہ اپنے مقصد کو گردش ایام کی گرد میں نہ دبنے دیا جائے اور دعوتی سرگرمیوں کو اپنی ترجیحات میں اولیت دے کر اپنی تنظیم کو اس طور ترتیب دیا جائے کہ دعوت و عمل ہر شخص کے دل کی دھڑکن اور کوششوں کا محور بن جائے۔ اس مقصد کے لیے ایسا لائحہ عمل اختیار کرنا جس میں قوی ایمان والے' کمزور ایمان والے اور اعلیٰ دینی معیار کے حامل' اوسط اور کم تربیت یافتہ لوگوں پر مشتمل بیش قیمت افرادی قوت' اسلامی انقلاب کی تحریک کا ہراول دستہ بن جائے اور ان سب کی صلاحیتیں اس کار عظیم میں صرف ہوں' مقاصد کے حصول کے لیے ضروری ہے۔
یہ امر واقعہ ہے کہ ہر زمانہ اور ہر دور اپنے تقاضے الگ رکھتا ہے۔ ایک کامیاب داعی کی طرح اپنے دور کے تقاضوں اور نئے چیلنج پر اجتہادی نگاہ ڈالتے ہوئے اسلامی تحریک کو کس طرح آگے بڑھایا جائے' اس حوالے سے محترم خرم مراد کا ایک خطاب پیش کیا جا رہا ہے۔ (مدیر)

ہماری دعوت ایک ازلی اور ابدی دعوت ہے۔ یہ اتنی قدیم تو ضرور ہے کہ جب لوح محفوظ پر اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور اس کی کتاب محفوظ کر دی گئی۔ اور ہمارے لیے اس لحاظ سے بھی قدیم ہے کہ اس ہدایت کا آخری پیغام خدا کے آخری نبی سرور کائنات' محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آج سے ۱۴ سو سال قبل نازل ہوا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ دعوت کی نئی جہت سے کیا مراد ہے؟ چند غور طلب پہلو حسب ذیل ہیں۔
دعوت کا عمل چند عناصر پر مشتمل ہے۔ اس میں خود دعوت کا موضوع اور اس کا مبحث بھی شامل ہے

جو ازل سے ایک ہی رہا ہے۔ خدا کا ہر نبی ایک ہی دعوت لے کر آیا۔ اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ہ (طٰہٰ ۲۰:۱۴) میں ہی اللہ ہوں' میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے' پس تو میری بندگی کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر ------ البتہ اس دعوت کے اجزا ایک سے زیادہ رہے ہیں۔ ان اجزا کے درمیان تقدیم اور تاخیر بھی ہوئی ہے اور ترجیحات کا نظام بھی بدلتا رہا ہے۔ تاہم کبھی کسی پر زور کم دیا گیا اور کبھی تاکید زیادہ ہوئی۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر دعوت کی نئی جہت کیا ہوئی؟

دعوت کا اسلوب: اگرچہ ہر زمانے' معاشرے اور مخاطب کے حوالے سے اسلوب دعوت اور زبان میں فرق واقع ہوتا گیا۔ ہر نبی ایک ہی دعوت لے کر آیا۔ تاہم اس نے اپنے معاشرے اور قوم سے اس کی روایات' تاریخ' ثقافت' حالات' اور اس کی زبان میں بات کی۔ اس کے عقائد کے حوالے سے کلام کیا۔ اس لحاظ سے کبھی عبودیت الٰہی کی دعوت کے ساتھ بلند و بالا عمارتیں تعمیر کرنے کے خلاف نکیر کی گئی اور کبھی استعماری (امپیریلسٹ) طاقت بن کر دنیا کی کمزور قوموں کو دبانے کے خلاف آواز بلند کی گئی۔ کبھی جنسی رویوں میں بے اعتدالی پر متنبہ کیا گیا اور کبھی معاشی معاملات میں' عدل و انصاف سے ہٹنے کی روش بدلنے کی دعوت دی گئی' یا کبھی وقت کے فرعونوں کے دربار میں کھڑے ہو کر اپنی قوم کی آزادی کا مطالبہ کیا گیا۔ کبھی بگڑی ہوئی مسلمان قوم کے عقائد' اعمال اور خدا کی طرف سے سپرد کردہ مشن میں ان کی کوتاہیوں پر انھیں پکارا گیا اور اصلاح کی طرف متوجہ کیا گیا۔ آج اگر آدمی نئی جہت کی تلاش کرے تو یہ سوچے گا کہ اس لحاظ سے تقدیم اور تاخیر' تاکید اور زور' اور ترجیحات میں کیا کوئی نئی روش یا نئے افق ہمارے سامنے آ سکتے ہیں۔

دعوت کا مقام: دعوت لانے والوں کے نزدیک ہمیشہ دعوت کا مقام ایک ہی رہا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے آنے کا مقصد اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف بلانا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو جمع کرنا' ان کو ایک قوت بنانا' اس قوت کے ذریعے بدی کے خلاف جہاد کرنا' فساد اور ظلم کو مٹا کر اس کی جگہ حق' فلاح اور انصاف قائم کرنا' یہ کام بھی انھوں نے سرانجام دیے۔ آج اگر کوئی دعوت کی جہت کا تعین کرنا چاہے گا تو اس کو یہ بھی غور کرنا پڑے گا کہ ان میں سے کس چیز کا کیا حصہ' کیا مقام اور کیا ترجیح ہے؟

داعی: دعوت کے عمل کا ایک عنصر داعی خود ہے۔ جن داعیان حق کا اسوہ ہمارے لیے قابل تقلید اور رہنمائی کی روشنی فراہم کرنے والا ہے' وہ خود براہ راست اپنے رب کی نگرانی اور رہنمائی میں دعوت کا کام کرتے رہے۔ ان کے بعد آنے والے لوگ جن کو یہی کام سپرد کیا گیا' ان میں بہت سے جانباز اور قدسی نفوس کی عظمت کا اندازہ لگانا کسی کے بس میں نہیں' اور اس قافلہ حق میں ہم جیسے' کمزور اور زمین کا بوجھ

بھی رہے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کمزور اور ناکارہ لوگ اگر دعوت کا کام کریں تو کس جہت سے کریں؟

دعوت کا مخاطب: دعوت کے عمل میں ایک عنصر دعوت کا مخاطب بھی ہے۔ دعوت کا ہر مخاطب اگرچہ ایک انسان ہے' لیکن اپنے مزاج' سوچ اور عزائم کے حوالے سے وہ ایک مختلف شے ہے۔ کوئی دو انسان ایک جیسے نہیں' اور نہ ان کو ایک ہی طرح دعوت پہنچائی جا سکتی ہے۔ اس لیے کہ ہر انسان کا ماحول' تعلیم و تربیت' مزاج اور سوچ مختلف ہوتی ہے۔ ماحول میں' معاشرے میں اور زمانے میں بھی تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے' جس سے لازمی طور پر مخاطب متاثر ہوتا ہے۔

آج اس صدی کے مخاطب فرد سے' جو چاروں طرف سے دنیا کی مختلف قوتوں کی زد میں ہے' جس کے ذہن' سوچ' افکار' لباس اور رہن سہن کی تشکیل ایک بے خدا تہذیب کے زیر سایہ ہو رہی ہے' اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اسلامی دعوت کے لیے کیا اسلوب وضع کر سکتے ہیں اور کیا جہت اختیار کر سکتے ہیں؟ یہ بات بھی غور طلب ہے۔

طریق دعوت: دعوت کا ایک عنصر خود طریق دعوت ہے۔ کیا روش' کیا رویہ اور کیا طرز عمل ہے جو حکمت کے مطابق ہو گا؟ پہلے چار عناصر سے مل کر ہی اس سوال کا جواب ملے گا۔

میں نے دعوت کی نئی جہتوں کے حوالے بہت سے سوالات اٹھا دیے ہیں۔ ان سب کا جواب کسی ایک گفتگو میں سمیٹنا ممکن نہیں۔ البتہ چند باتیں اہم ہیں جو آج داعیان حق کے سامنے رہنی چاہییں' جو ان کی توجہ اور غور و فکر کا مرکز ہونا چاہییں اور جن کی روشنی میں انھیں سوچنا چاہیے کہ ان کا طرز عمل دعوت کے بارے میں کیا ہو۔

ترجیحات میں دعوت کا مقام: سب سے پہلی چیز دین کے پورے نظام میں دعوت کا مقام اور اس کی ترجیح کا مسئلہ ہے۔ بہ ظاہر یہ ایک بڑا آسان سوال ہے' لیکن جو بھی ہمارے دینی لٹریچر سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ اس پر بڑی طویل بحثیں اور گفتگوئیں ہوئی ہیں اور یہ بحثیں ہمارے لٹریچر میں موجود ہیں۔ سفر کے آغاز کی طرح اس کا مقام اور اس کی ترجیح اسی طرح برقرار رہتی جس طرح کہ شروع میں تھی' تو یہ سوال کوئی اہمیت نہ رکھتا۔ لیکن میری رائے میں دعوت کے پھیلاؤ اور تنظیم کی مضبوطی کے ساتھ ساتھ' کاموں کی تعداد اور ان کی نوعیت میں اضافہ فطری امر ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ جو کام آج کرنا ہے یا جو کام فوری توجہ کا محتاج ہے وہی کام وقت' وسائل اور توجہ میں اولین مقام پاتا ہے۔ جس چیز کے بارے میں خوب سوچ سمجھ کر ایک فیصلہ دستور میں لکھا ہوا ہوتا ہے' کہ یہ سب سے اولین ترجیح ہے' اسے اپنے منصوبوں میں قرار واقعی مقام دیا جاتا ہے۔ مگر جب وقت کا دھارا بہتا ہے تو وہ ترجیح عموماً پیچھے چلی جاتی ہے۔
اسی لیے یہ سوال اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ سب سے پہلے اس موضوع پر کچھ باتیں عرض کروں گا۔

دعوت کا لفظ جب ہم بولتے ہیں تو اس کا ایک وسیع مفہوم ہے۔ جس میں اپنے نفس کو نیکی کی دعوت دینا' اور دوسروں کو نیکی کی طرف بلانا بھی شامل ہے۔ جو اپنے آپ کو بھول جائے اور خود کو دعوت نہ دے اور خود کو نہ پکارے اور نہ بلائے اور نفس کو نہ اکسائے کہ وہ صحیح راہ پر آئے اور صرف دوسروں ہی کے سامنے وعظ کرتا پھرے' تو ان کے اوپر قرآن مجید کی یہ آیت صادق آتی ہے:

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (البقرہ ۲: ۴۴)

تم دوسروں کو تو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لیے کہتے ہو' مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟

دعوت کے طریقوں کے اندر قول اور عمل دونوں شامل ہیں۔ اس لحاظ سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو شاید دعوت کے دائرے سے باہر ہو۔ دعوت کا عمل انفرادی طور پر بھی ہو سکتا ہے اور اجتماعی طور پر بھی۔

ہم یہاں اختصار کی خاطر دعوت سے مراد صرف وہ حصہ لیں گے' جس کا مقصد دوسروں کو اللہ کی طرف بلانا' اللہ سے جوڑنا اور اللہ سے ملاقات کے لیے تیاری کرنے پر آمادہ کرنا ہے۔ نیز زندگی میں وہ روش' وہ طرز عمل اور وہ اخلاق اختیار کرنا جو اللہ کو محبوب ہے۔ جس کی محبوبیت پر ہمں نے انبیا علیہم السلام کی معرفت مہر تصدیق ثبت کی ہے۔ اس لحاظ سے اگر آپ غور سے جس پہلو کو بھی دیکھیں تو اندازہ لگائیں گے کہ دعوت' بہت سارے کاموں میں سے ایک کام' بہت سارے مقاصد میں سے ایک مقصد اور بہت ساری ترجیحات میں سے ایک قابل ترجیح شے نہیں ہے بلکہ دراصل ایک مسلمان کی مسلمانیت کا یہی باعث' یہی مقصد اور یہی وجہ جواز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب اپنے نبی اور رسول بھیجے تو انھوں نے اپنی زندگی میں بہت سارے کام کیے' لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے آخر تک ایک ہی لقب سب سے زیادہ پسند کیا' اور وہ لقب تھا "رسول"۔ رسول کے معنی' پہنچانے والا' دعوت دینے والا اور داعی کے ہیں۔ اور جب رسولؐ سے خطاب کیا تو یہی فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝ (الاحزاب ۳۳: ۴۵-۴۶)

اے نبیؐ' ہم نے تمھیں بھیجا ہے گواہ بنا کر' بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر' اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔

حیات رسالت کے جس پہلو کی طرف بھی نظر ڈال کر دیکھیے' وہ دعوت کا کام ہے۔ گویا رسالت کا بنیادی فریضہ ہی یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرما دیا ہے کہ جو کچھ بھی تم کو دیا گیا ہے اس کو پہنچاؤ۔ اور اگر تم نے نہیں پہنچایا' یہ کام نہیں کیا' تو پھر تم نے اس کے پیغام کو پہنچانے کا حق ادا نہیں کیا۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ط (المائدہ ۵:۶۷)

اے پیغمبرؐ، جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔

اگر آپ تحریک اسلامی کی وجہ جواز پر غور کریں تو دیکھیں گے کہ تحریک، کار دعوت کے علاوہ اور کوئی مقصد اپنے سامنے رکھ ہی نہیں سکتی۔ یہ دعوت کے لیے وجود میں آئی ہے، ہر چیز اسی لیے ہے۔ یہ تنظیم، یہ اجتماعات اور یہ ساری سرگرمیاں بھی اسی لیے ہیں کہ اللہ کی بات اللہ کے بندوں تک پہنچے۔

اگر اللہ کے سامنے جواب دہی اور مسئولیت ہے، اور یقیناً ہے، تو وہ یوم عدل یہ سوال نہیں کرے گا کہ تم نے اسلامی نظام قائم کیا یا نہیں کیا؟ شریعت نافذ کی یا نہیں کی؟ حکومت الٰہیہ بنائی یا نہیں بنائی؟ اسلامی ریاست وجود میں لائے یا نہ لائے؟ لیکن جن کو بھیجا ہے ان سے ہم یہ ضرور پوچھیں گے کہ تم نے ہمارے پیغام کو پہنچانے کا حق کہاں تک ادا کیا؟ فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ o (الاعراف ۷: ۶) پس یہ ضرور ہو کر رہنا ہے کہ ہم ان لوگوں سے باز پرس کریں جن کی طرف ہم نے پیغمبر بھیجے ہیں اور پیغمبروں سے بھی پوچھیں (کہ انھوں نے پیغام رسانی کا فرض کہاں تک انجام دیا اور انھیں اس کا کیا جواب ملا)------ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی آخری شہادت اسی بات کی دی تھی کہ میں نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا اور تبلیغ کر دی۔ مطلب یہ کہ تحریک اسلامی کا اور اس کی سرگرمیوں کا اس کے سوا کوئی جواز نہیں ہے کہ وہ دعوت کا پیغام دوسروں تک پہنچائے۔

طریق دعوت: چند غور طلب پہلو

دعوت کی مسلمہ اہمیت کے پیش نظر طریق دعوت نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ مگر دعوت، توسیع دعوت اور موثر دعوت کے حوالے سے کئی غلط فہمیاں اور مغالطے پائے جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ آپ کے سامنے رکھوں اور ان پر بھی مختصر گفتگو کروں۔

فرد سے رابطہ: ایک مغالطہ یہ ہے کہ "دعوت کا کام دراصل فرد اور فرد کے درمیان ایک طویل رابطے کا کام ہے"۔ دعوت کا کوئی بھی کام جس میں بڑے بڑے اجتماعات کا انعقاد، یا بڑے بڑے گروہوں کو، یا پوری کی پوری قوموں کو مخاطب کرنا شامل ہے، دراصل ذہن کے اندر دعوت کا بیج ڈالنے کے مترادف ہے۔ انبیا کرام کا اسوہ یہ بتاتا ہے کہ ایک ایک فرد تک پہنچ کر دعوت دینا اور اس سے رابطہ رکھنا، دعوت کا صرف ایک پہلو تھا اور وہ بھی بالکل ابتدائی دور میں۔ لیکن جیسے ہی اللہ نے اپنے نبی کو یہ حکم دیا اب تم سب تک دعوت پہنچاؤ تو پھر اس دعوت کی پکار صفا کی پہاڑی سے بھی بلند ہوئی اور اس دعوت کے لیے گھر میں سرداروں کو دعوت پر بھی جمع کیا گیا۔ اس دعوت کے لیے عکاظ کے میلے میں کارنر میٹنگز بھی ہوئیں، جہاں جگہ جگہ کھڑے ہو کر یہی خطاب ہوا، اور دعوت حق کے یہی بیج بکھیرے جاتے رہے تاکہ جس کے

کان میں پڑ جائے، جس کے دل میں جڑ پکڑ لے، جو اس کو قبول کر لے، فبہا اور جو نہ قبول کرے تو یہ اس کی اپنی ناکامی ہے۔ دعوت کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو محدود نہیں کر سکتی۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ دعوت کا کام محض ایک ایک فرد کے ساتھ ربط رکھنے ہی سے ہو سکتا ہے، میرے خیال میں وہ انبیائے کرام کے طریقۂ دعوت کو سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔

توسیع اور استحکام: ایک مغالطہ یہ بھی ہے کہ "دعوت کا کام استحکام کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے۔ جتنی دعوت پھیلے، اتنا ہی استحکام ہو یا جتنا استحکام ہو اتنی ہی دعوت پھیلائی جائے، ورنہ بے شک دعوتی کام رکتا ہے تو رک جائے"۔ یہ بات بھی انبیا کرام علیہم السلام کے اسوہ سے ظاہر نہیں ہوتی۔ جان لینا چاہیے کہ استحکام، دعوت سے ایک الگ مقصد ہے۔ دعوت کا مقصد استحکام نہیں ہے بلکہ دعوت کا مقصد تو یہ ہے کہ اللہ نے اپنے پیغام کی جو امانت سپرد کی ہے، جس امانت پر آدمی کی نجات کا انحصار ہے، وہ امانت ہر انسان تک پہنچنا چاہیے۔ اس دعوت کو ماننا یا نہ ماننا، اس کے پیچھے چلنا یا اس کو قبول نہ کرنا، یہ اس فرد کا اپنا فیصلہ ہے۔ لیکن ایک داعی استحکام کے انتظار میں دعوت کے کام کو ترک کر کے نہیں بیٹھ سکتا۔

دعوت اور تربیت میں توازن: ایک مغالطہ دعوت اور تربیت کے درمیان توازن کا اٹھتا ہے کہ "تربیت کم ہو رہی ہے، دعوت زیادہ پھیل رہی ہے اور یہ ایک خطرناک علامت ہے"۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ہماری تحریک کی بنیاد میں یہ بات شامل ہے کہ تربیت کا سب سے پہلا اور سب سے موثر ذریعہ دعوت ہی ہے۔ سید مودودیؒ کے یہ الفاظ ان کی بہت ابتدائی تقریروں کے اندر موجود ہیں کہ ہماری تربیت کا طریقہ، فطری طریقہ ہے۔ اس طریقے کی بنیاد اس بات پر ہے کہ آدمی دعوت کو لے کر کھڑا ہو جائے۔ جب وہ دعوت کو لے کر کھڑا ہو جائے گا تو معاشرہ اور ماحول اور دعوت کا کام خود ہی اس کی تربیت کرتے چلے جائیں گے۔

داعی کے کردار کا معیار: دعوت کے معاملے میں ایک مغالطہ داعی کے کردار کا بھی پیدا ہوتا ہے۔ عرصے سے یہ بات چلی آ رہی ہے، غالباً دور صحابہؓ سے یہ مسئلہ موجود رہا ہے کہ اگر داعی کا اپنا کردار ابھی کسی معیار پر نہیں پہنچا تو کیا وہ دعوت کا کام کر سکتا ہے؟

اس مسئلے پر بہت تفصیل سے امام غزالیؒ نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں "امربالمعروف اور نہی عن المنکر" کے تحت بحث کی ہے۔ مختصراً دو جملوں میں انھوں نے پورا مسئلہ یوں حل کیا ہے۔ وہ ایک سوال اٹھاتے ہیں: کیا ایک فاسق آدمی کو جو خود شراب پیتا ہو، امربالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرنا چاہیے؟ کیا کسی دوسرے کو شراب سے روکنا اس کے لیے جائز اور صحیح ہے؟ وہ اس سوال پر تفصیلی بحث کرتے ہیں، پھر اس کے بعد کہتے ہیں: آدمی کے لیے دو حکم ہیں: ایک حکم یہ ہے کہ وہ شراب نہ پیئے۔ یہ اپنی جگہ پر

ایک علیحدہ حکم ہے۔ اور ایک حکم یہ ہے کہ وہ دوسروں کو شراب پینے سے روکے۔ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ (لقمٰن ۳۱: ۱۷) نیکی کا حکم دے، بدی سے منع کر------ یہ ایک دوسرا حکم ہے۔ ایک حکم کی تعمیل نہ کرنے سے دوسرے حکم کی تعمیل نہ کرنے کا جواز نہیں پیدا ہو سکتا۔ اگر آدمی روزہ نہیں رکھتا تو نماز بھی نہ پڑھے، یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ کوئی آدمی روزہ نہیں رکھتا، تو وہ حج بھی نہ کرے، یہ بھی کوئی آدمی نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے اس کی بات قبول نہ ہو، اس کی بات میں اثر نہ ہو، لوگ یہ کہیں کہ تم ہم کو کیسے کہنے کے لیے کھڑے ہو گئے، جب کہ تم خود شراب پیتے ہو۔ درحقیقت دونوں فرض اپنی جگہ پر علیحدہ علیحدہ ہیں اور ایک فرض پر عمل نہ کرنے سے دوسرا فرض ساقط نہیں ہو سکتا۔

صلاحیت اور استعداد کی کمی: ایک مغالطہ اپنی صلاحیت کا بھی پیدا ہوتا ہے کہ آج کے زمانے میں پیچیدہ مسائل ہیں جن کے حوالے سے طرح طرح کی بحثیں اٹھتی ہیں۔ جب تک ہمارے اندر اتنا علم نہ ہو، اتنی صلاحیت نہ ہو، اتنی استعداد نہ ہو کہ اس چیلنج کا کماحقہ جواب دے سکیں، اس وقت تک ہم دعوت کا کام بھلا کیسے کر سکتے ہیں؟ اس کا جواب اس حدیث میں بہت واضح طور پر آگیا ہے: بَلغوا عَنی وَلو کَان آیة۔ یعنی ایک آیت بھی تم کو معلوم ہے، تم جانتے ہو، تو اس کو پہنچاؤ۔ یہ نہیں کہ پہلے فلسفہ اور سارے علوم سے واقف ہو جاؤ، پھر تم دعوت کا کام کر سکتے ہو۔

دعوت کے کام میں عجلت: اسی طرح ایک اور مغالطہ یہ ہے کہ دعوت کا کام سست روی کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم جما کر اور کام کو مستحکم کرتے ہوئے کرنا چاہیے۔ اس میں عجلت نہیں کرنی چاہیے۔ یہ تاثر بھی پایا جاتا ہے کہ کسی ایک ملک میں بھی اسلامی نظام کامیاب نہیں ہو سکتا یا اسلامی انقلاب نہیں آ سکتا جب تک بین الاقوامی رائے عامہ تیار نہ ہو، یا جب تک کہ اربوں آدمی ہماری دعوت سے واقف نہ ہوں، اور کروڑوں آدمی اس کی حمایت کے لیے تیار نہ ہوں۔ جو تبدیلی ہمارے پیش نظر ہے یہ اس کے طریقۂ کار کا تقاضا ہے۔ اس کے لیے ہم استحکام چاہتے ہیں، تنظیم چاہتے ہیں، تربیت چاہتے ہیں اور کھرے اور پختہ کار لوگوں کا گروہ چاہتے ہیں۔ لیکن اس سب کا مقصد کیا ہے؟ یہی کہ نظام فاسق کی جگہ نظام حق قائم ہو۔ یہ نظام حق قائم ہوتا ہے، اللہ کی نصرت اور اسلام پر عمل کرنے والے صالح انسانوں کے ذریعے۔ یہ وہ دو وسائل ہیں جن سے بالآخر فتح نصیب ہو گی۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ o (الانفال ۸: ۶۲)

وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعے سے تمھاری تائید کی۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ o (الانفال ۸ : ۶۴)

اے نبیؐ، تمھارے لیے اور تمھارے پیرو اہل ایمان کے لیے تو بس اللہ کافی ہے۔

یہ بات غور طلب ہے کہ مومنین کی یہ جماعت جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ کیا ہے، کس طرح جمع ہوئی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کن کن طریقوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کے لوگوں کو نکالا۔ لوگوں کے دلوں کو پگھلانے، ان کو مسخر کرنے اور ان کو ایک عالمی انقلاب کے لیے کھڑا کرنے کے لیے آپؐ نے کیا اقدامات فرمائے۔ اس گروہ انسانی کو ایک قوت بنانے کے لیے آپؐ نے کون سے طریقے اختیار کیے کہ جس کے نتیجے میں اس قوت نے سو سال کے عرصے میں اسپین سے لے کر چین کے ساحل تک واقعی ایک عالمی اسلامی انقلاب برپا کر دیا۔ اس کے لیے آپؐ نے جو تدابیر اختیار کیں اور جس طرح لوگوں کو اپنے ساتھ ملایا، یہ ایک الگ باب ہے جس کا میں مختصراً تذکرہ کروں گا۔

دعوت کے طریقۂ کار اور اس کی نوعیت کا تقاضا ہے کہ یہ دعوت جتنی عام ہو سکے، اس کو اتنا عام ہونا چاہیے۔ ایک داعی حق، جہاں، جس طرح اور جس سے بھی معاملہ کرے اس میں دعوت کا پہلو سب سے زیادہ غالب ہونا چاہیے۔ سارے کام اسی محور کے گرد گھومنے چاہییں۔ اوقات، توجہات، ترجیحات، مالی اور مادی وسائل، اخلاقی اور روحانی وسائل، سب کاموں سے بڑھ کر اسی کام پر صرف ہونے چاہییں ورنہ دعوت سے منسوب تحریک ایک مدت گزرنے کے بعد دریا بننے کے بجائے خاک کا رزق بن جائے گی۔

یہ سوال بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ داعی کی اپنی سوچ، طریقۂ کار، حکمت عملی اور تدابیر کے حوالے سے وہ بنیادی باتیں کیا ہیں جو آج کے دور میں ہمارے سامنے رہنا چاہییں۔

ہر فرد ایک ممکنہ ساتھی: پہلی بنیادی بات جو دراصل سارے دین کی اور دعوت دین کی بنیاد ہے، وہ یہ ہے کہ ہر وہ انسان جس نے سوچ سمجھ کر دعوت کو مسترد نہیں کر دیا، وہ ایک ممکنہ ساتھی ہے۔ ایک قیمتی اثاثہ یا potential حلیف ہے۔ وہ ہمارا ساتھی بن سکتا ہے اگرچہ وہ دشمن ہو، اور کتنی ہی دشمنی پر اس نے کمر باندھ رکھی ہو۔ جس کو اللہ نے سوچنے کے لیے دل دیا ہے، دیکھنے کے لیے آنکھیں دی ہیں، سننے کے لیے کان دیے ہیں، جس نے اپنے کانوں پر اور دل پر مہر نہیں لگائی، جس نے اپنی آنکھوں پر پردہ نہیں ڈالا، جس نے اپنے آگے اور پیچھے دیوار نہیں کھڑی کر دی، ہمیشہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ وہ حق کی دعوت کو قبول کر لے۔

حضرت عمرؓ بن الخطاب جیسے مخالف، تشدد اور مار پیٹ کرنے والے، کمزوروں کا گلہ دبانے والے کے بارے میں جب یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو دین کے دائرے میں لائے گا اور ان کے ذریعے دین اسلام کو تقویت دے گا، تو پھر دیگر لوگوں سے کیوں یہ امید نہیں کی جا سکتی۔ بے شک ابوجہل اور ابولہب کو یہ سعادت نصیب نہ ہوئی۔ مگر عمرؓ بن العاص، ابوسفیانؓ، مغیرہؓ بن شعبہ کے ساتھ قریش کے اور ثقیف کے ان بے شمار لوگوں اور قبائل کے ان سرداروں کو دیکھیے جو دعوت کے ۲۳ برسوں میں سے

۲۱ سال تک معمولی درجے کے نہیں بلکہ نہایت سخت مخالف رہے، لیکن بالآخر وہ بھی اسی دعوت حق کی آغوش میں آ گئے۔ اور ان سب کے آنے ہی سے وہ قوت بنی جس نے آخرکار دنیا کو مسخر کیا۔

اگر مدینہ منورہ ان چند پاکیزہ نفوس پر مشتمل رہتا اور محض ایک خانقاہ یا مدرسہ بنا رہتا تو مدینہ کا انقلاب اسپین سے چین تک نہیں پھیل سکتا تھا۔ لیکن مدینہ ایک خانقاہ نہ تھی، مدینہ ایک مدرسہ نہیں تھا، مدینہ نے صرف چند پاکیزہ نفوس جمع کر لینے کو اپنا کام نہیں سمجھا تھا، بلکہ ہر طرح کے لوگ آئے، ہر قسم کے لوگوں نے لبیک کہا، بڑے بڑے پرانے دشمن آئے، وہ بھی آئے جو مال غنیمت کے لالچ میں آئے، وہ بھی آئے جنھوں نے آکر اونٹ اور خزانے اور پیسہ مانگا، وہ بھی آئے جو دربار نبوتؐ سے سونا اور چاندی لے کر گئے اور وہ بھی آئے جو اپنی قبائلی عصبیت و امتیاز پر فخر کرتے، اس کے رجز پڑھتے اور گیت گاتے ہوئے آئے، سبحان اللہ! ان سب کو رحمت للعالمینؐ کی آغوش رحمت نے اپنے اندر سمیٹ لیا اور سب کو جمع کر کے ایک ناقابل تسخیر قوت بنا دیا۔

انسان تو سونا چاندی کی کان اور معادن کی طرح ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے اندر سونے چاندی کی صلاحیتیں ہیں، وہ جاہلیت میں قیادت کر رہا ہو یا اسلام میں قیادت کر رہا ہو، دونوں جگہ یکساں طور پر کام کرے گا۔ جو تم میں جاہلیت میں قائد ہیں اور بہتر ہیں وہی اسلام میں آ کر قیادت اور اپنی صلاحیت سے اسلام کو فائدہ پہنچائیں گے۔ خیارکم فی الجاھلیة خیارکم فی الاسلام۔

تحریک اسلامی کا مقصد بھی واضح ہے۔ ہمارا مقصود، کوئی مدرسہ یا کوئی خانقاہ بنانا نہیں ہے بلکہ وہ تحریک بنانا ہے جو ان بکھرے ہوئے قیمتی قطروں کو ایک دریا بنا دے، ایسا دریا جو سارے عالم کو پیغام الٰہی سے سیراب کر سکے۔ اس حقیقت کو ذہن نشین کر لیا جائے تو ہر انسان ہمارا ممکنہ ساتھی ہے۔ بلکہ وہ لوگ جو جاہلیت میں پیش پیش ہیں، وہی لوگ اسلام میں آ کر قیادت میں پیش پیش ہو سکتے ہیں۔

اس بات کا تقاضا ہے کہ جو جتنا آ جائے اس کو اتنا قبول کر لیا جائے۔ جب وہ قدم بڑھاتے ہوئے آ جائے تو اس کی آمد کے محرکات سے بحث نہ کی جائے، اور اس کی نیت میں جھانک کر نہ دیکھا جائے۔ اس کے دل کے اندر اتر کر یہ تلاش کرنے کی کوشش نہ کی جائے کہ یہ کیوں آ رہا ہے اور کس لیے آ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر عین تلوار کے نیچے آکر کوئی کہے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ، تو حکم ہے کہ اس کے اوپر سے تلوار ہٹا لی جائے اور اس کو صاحب ایمان لوگوں کے گروہ میں شامل کر لیا جائے۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ کے بارے میں روایت ہے کہ ایک کافر سے ان کی لڑائی دست بدست ہو رہی تھی، بالآخر انھوں نے اس پر قابو پا لیا اور وہ ان کی تلوار کے نیچے آ گیا۔ سارے قرائن جن کو ہماری زبان

میں واقعاتی شہادت (circumstantial evidence) کہتے ہیں، وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتے تھے کہ یہ کلمہ جاں بچانے کے لیے ہے، یہ کلمہ دل سے نہیں نکلا۔ اس لیے حضرت اسامہؓ نے اپنی تلوار کا وار نہیں روکا اور اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔ حضور رحمتؐ کو اس واقعے کی خبر دی گئی۔ راوی بیان کرتا ہے کہ آپؐ کے چہرے پر غصے کی لہر دوڑ گئی۔ آپؐ اپنے چہیتے صحابیؓ سے اس قدر ناراض ہوئے کہ آپؐ کبھی اندر جاتے اور کبھی باہر آتے اور کہتے تھے: اسامہ، تم قیامت کے روز اس کے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا کیا جواب دو گے؟ اور تم نے اس کے دل میں جھانک کر کیسے دیکھ لیا؟

اسی طرح ایک صحابیؓ نے کہا کہ میرے دشمن نے میرا ایک ہاتھ کاٹ دیا اور اب میرا ایک ہی ہاتھ باقی ہے۔ اور وہ میری تلوار کے نیچے آگیا اور کہتا ہے لا الٰہ الا اللّٰہ، کیا میں اس کو چھوڑ دوں؟ آپؐ نے کہا: چھوڑ دو۔ اور اگر تم نے نہیں چھوڑا تو پھر آخرت میں تم اس کی جگہ ہو گے اور وہ تمھاری جگہ۔ تم جہنم میں ہو گے اور وہ جنت میں ہو گا۔

آپ ان سارے وفود کی داستانیں پڑھیے جو صلح حدیبیہ کے بعد مدینہ آتے تھے۔ سیرت کے ذخیروں کے اندر ان کی تفصیل موجود ہے، کہ اس وقت طرح طرح کے اور ہر قسم کے لوگ آئے۔ میں صرف ایک وفد کے احوال مختصراً آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

یہ طائف کے قبیلہ ثقیف کا وفد تھا جو تبوک سے رسولؐ اللہ کی واپسی کے بعد رمضان ۹ ہجری میں حاضر خدمت ہوا۔ قریش کے بعد یہ عرب کا سب سے بڑا قبیلہ تھا۔ اس کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی اور ساتھ ہی ساتھ جنگ جو اور طاقت ور بھی تھا۔ اس قبیلے نے حضورؐ پر سب سے بڑھ کر زیادتی کی تھی۔ جس کے سرداروں نے آنحضورؐ کی تضحیک اور توہین کی اور تشدد کرنے اور پتھر برسانے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا۔ جس کے بارے میں آپؐ نے فرمایا تھا کہ میری زندگی میں اگر سب سے زیادہ سخت دن گزرا ہے تو وہ طائف کا دن تھا۔ فتح مکہ کے بعد آپؐ نے طائف کا محاصرہ کیا۔ آپؐ جدید ترین آلات سے مسلح تھے۔ ادھر سے بمباری ہو رہی تھی جس سے مسلمانوں کا جانی نقصان بھی ہوا، ان کا بھی ہوا۔ اس کے بعد آپؐ نے ساتھیوں سے مشورہ کیا تو ایک بزرگ آدمی نے جو شاید بڑا سیاست دان ہو گا، مشورہ دیا کہ لومڑی تو اپنے بل میں جا چکی۔ اگر آپؐ اس کو چھوڑ دیں گے تو یہ آپؐ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔ اگر آپؐ شکست دیں گے تو شکست کھانے کے بعد آپؐ کا بھی نقصان ہو گا اور ان کا بھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپؐ محاصرہ اٹھا کر مدینہ واپس چلے گئے۔

چند مہینے کے بعد ثقیف نے محسوس کیا کہ اب عرب کے جزیرے میں ایک کافر قبیلہ یوں الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ اس احساس کے بعد ان کے سردار عبد یالیل بن عمرو کی قیادت میں ایک وفد رسولؐ اللہ کی

خدمت میں مدینہ منورہ آیا۔ اب دیکھیے کہ صحابہؓ کی خوشی کا کیا عالم تھا۔ وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جا رہے تھے کہ کون جا کر رسولؐ اللہ کو یہ خوش خبری سنائے کہ ثقیف کا وفد آیا ہے۔ مغیرہؓ بن شعبہ دوڑے تو ابوبکر صدیقؓ آئے اور انھیں قسم دی کہ تم رک جاؤ میں جا کر حضورؐ کو یہ خوش خبری سناؤں گا۔ حضورؐ کو خوش خبری پہنچی تو آپؐ نے مسجد نبویؐ میں ان کے لیے خیمے نصب کروا دیے۔ جو وفد آتا تھا' اس کے لیے بڑی ضیافت کے سامان ہوتے تھے۔ ان کو تحائف دیے جاتے تھے۔ بعض وفود کے ایک ایک فرد کو خیر سگالی کے جذبے سے ۵ / اوقیہ چاندی دی جاتی تھی اور وفد کے لیڈر کو زیادہ چاندی دی جاتی تھی۔ یہ تو ہر وفد کے ساتھ معاملہ تھا۔ لیکن یہ ثقیف کا وفد تھا جس پر آیندہ مسلمانوں کی قوت کا انحصار تھا۔ آپؐ نے ان کی بڑی ضیافت اور مہمان داری کی۔ روز نماز عشاء کے بعد ان کے پاس جا کر بیٹھ جاتے تھے اور بات کیا کرتے تھے۔ اہل طائف نے اسلام قبول کرنے کے لیے شرائط عائد کرنا شروع کر دیں: حضورؐ کیا ہم کو زنا کی اجازت ہو گی؟ حضورؐ کیا ہم سود کھا سکیں گے؟ حضورؐ کیا ہم شراب خوری کر سکیں گے؟ حضورؐ کیا ہمارے معبود "لات" کے مجسمے کو برقرار رہنے دیا جائے گا؟ آپؐ ہم کو ایک دستاویز پر یہ سب کچھ کرنے کی اجازت دے دیجیے' ہم اسلام قبول کر لیتے ہیں۔

آپؐ ان کی سب شرائط منظور کرنے سے انکار کرتے رہے۔ آخر میں انھوں نے کہا اچھا! ہم زکوٰۃ نہیں دیں گے اور جہاد ہم پر سے معاف ہونا چاہیے۔ آپؐ نے کہا ٹھیک ہے' میں تمھاری یہ دو شرطیں مان لیتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز ہم اور آپ نہیں مان سکتے' صرف حضورؐ ہی مان سکتے تھے' اس لیے کہ آپؐ خود شارع تھے۔ آپؐ نے فرمایا: یہ دو شرطیں میں مان لوں گا' زکوٰۃ مت دینا' جہاد مت کرنا۔ پھر آپؐ نے ایک صحابیؓ سے' جو راوی ہیں' یہ فرمایا کہ یہ مسلمان ہو جائیں گے تو ایک سال میں خود بخود زکوٰۃ بھی دیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔ حکمت کے تحت آپؐ نے ان کی شرائط منظور کر لیں اور معاہدہ لکھا گیا۔

ان کا ایک بت تھا' جس کا نام لات تھا۔ اب انھوں نے کہا کہ لات کا کیا بنے گا؟ آپؐ نے کہا: اس کو تو گرایا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو نہیں ہو سکتا۔ ہم آپؐ پر ایمان لے آئیں اور پھر جا کر بت کو بھی گرا دیا جائے۔ ہم نہیں گرائیں گے' آپؐ کسی اور کو بھیج دیجیے۔ آپؐ نے حضرت خالدؓ بن ولید کی سربراہی میں ایک مختصر سی ٹیم روانہ کی' جس میں حضرت مغیرہؓ بن شعبہ بھی تھے۔ انھوں نے جا کر بت گرا دیا۔ اس حالت میں یہ لوگ ایمان لائے۔ یہ وہ قبائل تھے جو گروہ در گروہ ایمان لائے۔ قرآن نے ان کے بارے میں کہا ہے: يَدْخُلُوْنَ فِي دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجاً۔ یہ تمام لوگ جو برسا برس تربیت کی کٹھالی سے نہیں گزرے تھے' سب کے سب دامن رحمتؐ میں سمائے گئے۔

یہ وہی بات ہے جیسا کہ میں نے کہا کہ ہر آدمی اس دعوت حق میں ہمارا ممکنہ ساتھی ہے' اور ساتھ

ملنے والا ہر فرد جہاد کر سکتا ہے۔ یاد رہے کہ عدالت میں گواہی کے لیے عادل ہونا شرط ہے' جہاد کرنے کے لیے اسلام نے کوئی شرط نہیں لگائی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ میدان جنگ میں جو فرد شراب کی حد میں گرفتار ہوا' اس نے بھی کمانڈر کی بیوی سے درخواست کی تھی کہ میری زنجیریں کھول دو تاکہ میں جاکر جہاد کروں' تو حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی بیوی نے ان کی زنجیریں کھول دیں۔ اس نے جاکر جہاد کیا اور جہاد سے آنے کے بعد پھر خود زنجیریں پہن لیں۔

جو تحریک ایک عالمی انقلاب لانے اور اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے کھڑی ہو' اور جو اپنی سرشت کے اعتبار سے کوئی خانقاہ اور مدرسہ نہ ہو' دعوت کے باب میں اس کی روش اس کے علاوہ کوئی اور ہو نہیں سکتی کہ وہ ہر فرد کو تحریک دعوت اسلام کا ایک قیمتی اثاثہ' potential اور ایک کارکن سمجھے۔ اگرچہ وہ کتنا ہی مخالف کیوں نہ ہو' وہ کیسا ہی دشمن ہو' اس نے کتنے ہی مظالم ڈھائے ہوں' سب معاف کر دیے جائیں گے۔ انھیں عام معافی دی جائے گی۔ فتح مکہ کے موقع پر' وہ لوگ جنھوں نے بہت زیادہ زیادتیاں کی تھیں' ان میں سے ۹ کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا تھا کہ یہ خانہ کعبہ کے پردے کے نیچے بھی پائے جائیں تو انھیں نہ چھوڑا جائے۔ مگر اس حکم کے باوجود آپؐ نے ۹ میں سے ۵ کو معاف فرما دیا' جب کہ ۴/ افراد مارے گئے۔ جن ۵ کو آپؐ نے معاف فرمایا تھا' یہ سب برسوں کے دشمن تھے مگر اب انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ لہٰذا جو شخص جس حالت میں قافلہ حق سے قدم ملائے' اس دعوت کو قبول کرے' اور جتنا بھی اپنے آپ کو سپرد کر دے' اس کو اپنے ساتھ لے کر چلنا چاہیے۔ ایسے افراد کو ساتھ لے کر چلنا' یہ تحریک اور تحریک چلانے والے تربیت یافتہ نفوس کا کمال ہے کہ وہ اس کام کو خوبی سے سرانجام دیں۔ اس کے برعکس اگر وہ اپنے دائرے کے اندر محصور رہیں' تو پھر وہ تحریک کے پروردہ کارکن نہ ہوں گے' ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی صوفی کی خانقاہ سے نکلے ہوئے مرید ہوں۔

استعداد اور استطاعت کا لحاظ : دوسری بات جو دعوت میں حضورؐ کے سامنے تھی وہ یہ کہ دین کو آسان کر کے پیش کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ مکہ کی زندگی میں اسلام کا لفظ اس طرح معروف نہیں تھا جس طرح آج ہم بار بار دین اسلام کہتے ہیں۔ یہ لفظ مدینہ میں جانے کے بعد معروف ہوا۔ مکہ کی زندگی میں ایک اور لفظ بولا جاتا تھا' وہ لفظ تھا الیسریٰ۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى o وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى o فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى o (الیل ۹۲: ۵ ـ ۷)

تو جس نے (راہ خدا میں) مال دیا اور (خدا کی نافرمانی سے) پرہیز کیا' اور بھلائی کو سچ مانا' اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے۔

گویا " یسریٰ " یعنی آسان راستہ' رب کی رضا کا راستہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس لفظ کو منتخب کر کے

قرآن مجید میں جڑ دیا۔ یہ راستہ کوئی مشکل راستہ نہیں ہے' ناقابل عبور راستہ بھی نہیں ہے بلکہ آسان راستہ ہے۔ اس موضوع کے' آسان ہونے کے بہت سے پہلو ہیں لیکن یہاں صرف اشارہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ہر شخص سے اس کی استعداد اور استطاعت کے مطابق معاملہ کرنا' اور دین کی بنیادی باتوں پر کوئی مداہنت برتے بغیر ہر ایک کے سامنے اس طرح دین پیش کرنا کہ اس کو وہ آسانی سے قبول کر لے' مطلوب ہے۔ یسروا ولا تعسروا' آسان کرو تنگ مت کرو۔ بشروا ولا تنفروا' خوش خبری دو متنفر مت کرو۔ دین کے مطالبات اس طرح پیش کرو کہ وہ اس کو آسانی سے قبول کرے۔ نبوتؐ کی ۲۳ سالہ حیات مقدسہ اس پر شاہد ہے۔ قبیلہ ثقیف کی مثال بھی اسی "تیسر" کا ایک حصہ ہے۔ اور بھی بہت سارے معاملات میں اس کا جلوہ دیکھا جا سکتا ہے۔

دین کے مطالبات میں تدریج: دعوت دین کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ دین کے مطالبات انسان کے سامنے تدریج کے ساتھ رکھے جائیں۔ سارے کے سارے مطالبات کا بوجھ ایک دم نہ لاد دیا جائے۔ اس لیے کہ جب تک ایمان کے ذریعے آدمی کی تربیت نہ ہو گی' وہ پورا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا۔ حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ شراب کی بندش کا حکم تین اقساط میں نازل ہوا۔ پہلی دفعہ کہا گیا کہ شراب کے نقصانات زیادہ ہیں اور فوائد کم۔ دوسری دفعہ کہا گیا کہ نشے کی حالت میں نماز مت پڑھو' اور جب تک یہ احکام نازل ہوئے اس وقت تک غزوہ بدر اور غزوہ احد میں بڑے بڑے صحابہؓ شہید ہو چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے بعض شراب پیا کرتے تھے۔ اس کے بعد حکم آیا کہ اچھا اب رک جاؤ' تو وہ فوراً رک گئے۔ اس حکم کی تعمیل کرنے والے بھی صحابہؓ ہی تھے۔ وہ قرآن مجید کی تربیت سے واقف تھے' ان کے لیے یہ کوئی اجنبی بات نہ تھی۔ غور طلب بات یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ جن کا تفقہ فی الدین بڑے بڑے صحابہؓ سے بھی اونچا تھا وہ فرماتی ہیں کہ اگر پہلی ہی دفعہ لوگوں سے کہا جاتا کہ شراب مت پیو تو لوگ نہ مانتے------ وہ لوگ جو مکہ یا مدینہ کی زندگی میں ساتھ تھے ------ ان کے بارے میں فرماتی ہیں کہ وہ لوگ نہ مانتے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے شراب کی بندش کا حکم تین اقساط میں جاری فرمایا۔

نبی کریمؐ نے حضرت معاذؓ بن جبل اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو یمن بھیجا اور کہا کہ ایک ترتیب کے ساتھ کام کرنا۔ پہلے ان کو ایمان کی دعوت دینا جب وہ ایمان قبول کر لیں تو پھر ان کو پانچ وقت کی نماز کا بتانا۔ جب نماز پڑھنے لگیں تو پھر زکوٰۃ کا ذکر کرنا۔ پھر آہستہ آہستہ سارے دین کی تعلیم دینا اور اس کے بعد پھر آپؐ نے وہی بات فرمائی: بشروا ولا تنفروا' خوش خبری دینا متنفر نہ کرنا۔ یسروا ولا تعسروا' تم دونوں آسانی پیدا کرنا تنگی مت کرنا۔

جو بھی آتا تھا' جو مانگتا تھا' جو آپؐ کے پاس ہوتا تھا' وہ آپؐ عطا کرتے تھے۔ ایک موقع پر ایک

عورت آئی۔ اس نے کہا کہ محمدؐ ہمیں بھی دو۔ آپؐ نے کہا' جتنا جانوروں کا گلہ ہے تم سب لے جاؤ۔ اس نے کہا کہ جو آدمی اتنا فیاض ہے' وہ جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ کسی تقریر یا دلیل سے جو بات سمجھ میں نہ آئی' وہ فیاضی سے سمجھ میں آ گئی۔

ایک آدمی نے آکر آپؐ کی گردن میں چادر ڈال دی' کھینچنا شروع کیا یہاں تک کہ گردن پر نشان پڑ گئے۔ صحابہؓ کو غصہ آیا' مارنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ آپؐ نے کہا' رہنے دو اور مسکراتے رہے۔ اس کے بعد آپؐ کے سامنے کچھ مال آیا' آپؐ نے وہ مال اس کو دے دیا اور رخصت کر دیا۔ یہ اخلاق کریمانہ تھے۔ یہ اکرام تھا مہمانوں کا جو آپؐ کیا کرتے تھے۔

نجران' عرب میں عیسائیوں کا سب سے بڑا علاقہ تھا۔ وہاں سے اتوار کے دن عیسائی مدینہ پہنچے۔ ان کو آپؐ نے مسجد نبویؐ میں اپنے مہمان کی حیثیت سے ٹھہرایا۔ انھوں نے کہا کہ آج تو ہماری عبادت کا دن ہے۔ آپؐ نے کہا کہ مسجد نبویؐ میں عبادت کر لو۔ چنانچہ عیسائیوں نے مسجد نبویؐ میں اپنے مذہب اور طریقے کے مطابق اپنی نماز پڑھی۔

حضورؐ مہمانوں سے اکرام اور فیاضی کا سلوک کیا کرتے تھے۔ ایک صحابیہ حضرت رملہؓ بنت حارثہ تھیں۔ ان کا مکان تو اسی کام کے لیے وقف تھا کہ جو وفد بھی آتا' خواہ اس کی تعداد کم ہوتی یا زیادہ' انھی کے ہاں مہمان ٹھیرایا جاتا۔ وہ ان کے لیے اچھے اچھے کھانے پکاتیں۔ آپؐ ان کو اپنا پیغام بھی پہنچاتے' پھر خود ہدیے اور تحائف دیا کرتے تھے اور قبول بھی کیا کرتے تھے۔ ایک قبیلے کا سردار آیا۔ اس نے آپؐ کی خدمت میں ایک قبا (گاؤن) پیش کی' جو سندس کی بنی ہوئی تھی۔ سندس ایک ریشمی کپڑا ہے۔ اس قبا پر بہترین کام بنا ہوا تھا۔ اگرچہ آپؐ مردوں کے لیے ریشمی کپڑا ممنوع قرار دے چکے تھے' تاہم مہمان کی خوشی اور دل داری کے لیے خوشی سے قبول کیا۔ آپؐ نے اس کے اوپر کوئی فتویٰ صادر نہیں کیا' بلکہ ہدیہ وصول کرنے کے بعد شکریہ ادا کیا۔ اگرچہ خود استعمال نہیں کیا لیکن لے کر رکھ لیا۔

مال' زمین اور جاگیروں کے فرامین تو بے شمار ہیں جو آپؐ نے جاری کیے۔ جو وفد آتا تھا' تو اس کا علاقہ آپؐ اسی کے لیے لکھ دیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپؐ نے کسی قبیلے کے سردار کو اس کی سرداری سے معزول نہیں فرمایا بلکہ ان کو اپنی جگہ پر برقرار رکھا۔ وہ آتے تھے اور صرف ایک دن کے ہی مومن ہوتے' مگر جاتے وقت اپنی سرداری کے ساتھ واپس جاتے تھے۔ قبیلہ ثقیف سے جو معاہدہ کیا اس کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ ہمارا سردار ہمیشہ ہمارے قبیلے میں سے ہو گا۔ جیسے کوئی آج یہ کہے کہ سندھ کا گورنر ہمیشہ سندھی ہو گا' یا پنجاب کا گورنر پنجابی۔ آپؐ نے اس کو بھی قبول فرمایا۔ یہ باقاعدہ معاہدے میں لکھا گیا اور اس پر دستخط ہوئے۔ یہ تھا دعوت کا' عام دعوت اور ہر ایک تک دعوت پہنچانے کے لیے پالیسی اور رویہ۔

مطلب یہ کہ جو جتنا بچ جائے اتنا بچانا ہے' جو جیسا ہے اس کو لینا ہے' جو جتنا مل سکتا ہے اسے لے کر حق کی قوت بنانا ہے۔

آج کوئی کوتاہ نظر اور کم ظرف آدمی یہ اعتراض بھی کر سکتا ہے کہ آپؐ نے وصال فرمایا ہی تھا کہ قبیلوں کے قبیلوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا' اور اس طرح کے نووارد لوگ مرتد ہو گئے اور جھگڑے شروع ہو گئے۔ یہ اعتراضات کوئی کم ظرف ہی کر سکتا ہے' لیکن وہ اس بات سے بھی آنکھیں بند نہیں کر سکتا کہ اسی دعوت اور اسی پالیسی کے نتیجے میں بالآخر وہ حیرت انگیز انقلاب آیا جس کی مثال انسانیت کی تاریخ پیش کرنے سے عاجز ہے۔ شہروں اور ملکوں نے اپنے دروازے کھول دیے۔ ایک سیلاب کی طرح اسلام بڑھا۔ ایک طرف بحر اوقیانوس کے ساحل تک پہنچ کر مسلمان کمانڈر نے کہا: اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ اس کے آگے بھی اللہ کی کوئی زمین ہے تو میں اپنے گھوڑے سمندر میں ڈال دیتا۔ دوسری طرف مسلمان سندھ میں پہنچ گئے۔ اسی طرح چین' کاٹھیاواڑ' گجرات' انڈونیشیا اور ملائیشیا تک مسلمان تاجر اور مبلغ پہنچ گئے۔ روایت ہے کہ چین کے شہر کینٹن میں صحابہؓ کی قبریں ہیں۔ یہ سب جگہیں کسی فوج کشی سے نہیں زیر ہوئیں۔ مسلمان جہاں گئے ان کا یہی اعلان تھا' یہی وسعت قلبی تھی' دعوت کی یہی اسپرٹ اور ان کا یہی جذبۂ صادق تھا جس نے بالآخر اسلام کو ایک عالم گیر دین اور ایک عالم گیر انقلاب کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ تنگ نظری' تنگ ظرفی اور تنگ دامنی قوموں اور انسانوں کو قوت نہیں بنا سکتی۔

یہی دراصل دعوت کا اصل پیغام ہے (کیسٹ سے تدوین : س ۔ م ۔ خ)۔

کشمیر کے وفا شعار آپ کی توجہ چاہتے ہیں

کشمیر کے شہیدوں' مجاہدوں' زخمیوں اور اسیروں کی بے یارومددگار مائیں' بہنیں' بچے اور وفا شعار مجاہد جو بھوک' بیماری' برف اور بارود کی بارش میں قابض بھارتی فوج سے لڑ رہے ہیں

وہ جو تکمیل پاکستان کے لیے اپنی جانیں لٹا رہے ہیں
ان کے اجڑے گھروں کو بھی یاد رکھیں

کشمیر .... جہاں

۶۱۱۹۰ بچے' بوڑھے' خواتین اور جوان شہید ہوئے۔ ۸۶۳۲۷ زخمی ہوئے۔ ۵۶۶۱۷ عقوبت خانوں میں بند ہیں۔ ۶۵۷۵ نوجوان معذور ہیں۔ ۴۲۱۰۰ افراد ہجرت پر مجبور ہوئے۔ ۳۸۱۵۳ گھر اور اسکول جلا دیئے گئے۔ اور کنٹرول لائن پر حالیہ بھارتی گولہ باری سے ہزاروں خاندان بے گھر ہوئے۔

ان کے لیے اپنے نقد

عطیات **صدقات** **زکوٰۃ**

الگ الگ

چیک / ڈرافٹ بنام جناب عبدالرشید ترابی اکاؤنٹ نمبر 1797 بنوا کر درج ذیل پتہ پر ارسال کریں۔

اور اجناس (گرم کپڑے' کمبل' بستر اور راشن) جماعت اسلامی کے قریبی دفاتر میں جمع کرائیں یا براہ راست ذیل پتہ پر بھجوائیں

عبدالحلیم خان (مرکزی ناظم مالیات)' جماعت اسلامی' آزاد جموں وکشمیر

415- پونچھ ہاؤس' صدر' راولپنڈی
فون : 051 - 511417
فیکس : 051 - 510197

یا

عیدگاہ روڈ' مظفر آباد' آزاد جموں وکشمیر
فون : 0581 - 2334 , 4336 , 5482
فیکس : 0581 - 2580

اخوان المسلمون

حسن البنا سے مصطفیٰ مشہور تک

ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی ٥

(تیسری اور آخری قسط)

السید عمر تلمسانیؒ کے حادثۂ وفات کے بعد اخوان نے استاذ محمد حامد ابوالنصرؒ کو چوتھا مرشد عام منتخب کیا۔ یہ عظیم ذمہ داری آپ کو مئی ۱۹۸۶ میں سونپی گئی۔ آپ بہت کم گو تھے اور خطابت و تحریر سے گریزاں رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی صرف ایک کتاب **حقیقۃ الخلاف بین الاخوان المسلمین وعبد الناصر** منظر عام پر آئی۔

استاذ محمد حامد ابو النصرؒ (۱۹۱۳۔۱۹۹۶)

استاذ ابوالنصرؒ فروری ۱۹۱۳ میں مصر کے مردم خیز خطے اسیوط کے شہر منفلوط میں پیدا ہوئے۔ خاندان علم دوست اور محب وطن تھا۔ دادا شیخ علی ابو النصر اپنے دور کے معروف علمائے ازہر میں سے تھے۔ ثانوی تعلیم کی تکمیل کے بعد والد کی جایداد کی حفاظت اور نگرانی کے لیے یکسو ہو گئے کیونکہ لمبی چوڑی زراعتی زمین کے وارث تھے۔ ۱۹۳۳ کے اواخر میں شیخ حسن البناؒ سے ملاقات ہو گئی اور ان کی دعوت اور جدوجہد سے ایسے متاثر ہوئے کہ پوری زندگی داؤ پر لگا دی۔ مصر کی سطح مرتفع کے علاقے میں اخوان میں سب سے پہلے آپ ہی نے شمولیت اختیار کی۔ منفلوط کی شاخ کے ایک ذمہ دار کے منصب سے بہ تدریج ترقی کرتے ہوئے ہیئت تاسیسی کی رکنیت سے سرفراز ہوئے۔ پھر جماعت کی سب سے بااختیار مجلس مکتب الارشاد کے

---

٥ ریڈر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی

رکن منتخب ہوئے۔ قید وبند کے تمام جاں گسل مراحل سے دوسرے اخوانی رہنماؤں کی طرح شیخ ابوالنصرؒ بھی گزرے۔ ۱۹۵۴ کے حادثے میں گرفتار کیے گئے تو ۲۵ سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ بعض مبصرین کا خیال ہے کہ شاہ فاروق کے اس دور میں حکومت کو اگر جمال عبدالناصر کا خوف نہ ہوتا جو اسیوط سے منسوب ہونے کی وجہ سے شیخ کو جانتا تھا' تو انھیں پھانسی پر لٹکا دیا گیا ہوتا۔ ۲۵ سال کی یہ مدت جیل میں ان کی ثبات و استقامت اور صبرو رضا' مقصد سے کامل شیفتگی اور اس کی راہ میں کھلم کھلا جاں سپاری کا درخشاں اور تابناک دور ہے۔ ۱۹۷۴ میں انھیں جیل کے مظالم سے رہائی نصیب ہوئی۔

استاذ محمد حامد ابو النصرؒ کے ۱۰ سالہ دور قیادت میں اخوان نے سیاسی سطح پر غیر معمولی کامیابیاں حاصل کیں۔ گرچہ تنظیمی سطح پر وہ اب بھی خلاف قانون رہی مگر عوام میں اس کی جڑیں پھر گہری ہوئیں اور اس کے وجود کو برابر تسلیم کیا گیا۔ ملک کی پیشہ ورانہ تنظیموں اور کالجوں اور یونی ورسٹیوں کی تدریسی انجمنوں پر اخوان کے کارکن اور رہنما حاوی رہے۔ ان کے تمام انتخابات میں اسلام پسندوں کو فتح حاصل ہوئی۔ اپریل ۱۹۸۷ میں' حزب العمل اور حزب الاحرار سے مفاہمت کر کے اخوانی کارکنوں نے پارلیمانی انتخابات میں حصہ لیا اور پہلی بار جماعت کی تاریخ میں مصری پارلیمنٹ میں ۳۶ / اخوانی امیدوار کامیاب ہو کر پہنچے اور کامیاب حزب اختلاف کا کردار ادا کیا۔ ۱۹۸۹ کے مجلس شوریٰ کے وسط مدتی انتخاب میں بھی اخوان نے حصہ لیا۔ ۱۹۹۰ کے پارلیمانی انتخابات کے مقاطعے میں بھی اخوانی کارکنوں نے قائدانہ کردار ادا کیا۔ بعد میں دوسری سیاسی پارٹیوں کو بھی اس مقاطعے میں شامل ہونا پڑا۔ اخوان نے بائیکاٹ کا یہ فیصلہ ایمرجنسی کی توسیع کے خلاف کیا تھا۔ ۱۹۹۲ کے مقامی انتخابات میں بھی اخوان شامل رہے۔ ۱۹۹۳ میں صدر حسنی مبارک کی مدت صدارت کی تیسری بار توسیع کی اخوانیوں نے مخالفت کی' جس کی وجہ سے ان کے ۸۲ قائدین کو ۱۹۹۵ میں فوجی عدالتوں میں جھوٹے مقدمات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سے ۵۴ کو جیل کی ہوا کھانی پڑی۔

چوتھے مرشد عام کے دور میں تنظیم الاخوان المسلمون داخلی استحکام اور تدریجی استقرار سے بھی ہم کنار ہوئی۔ مقامی شاخوں سے لے کر مکتب الارشاد کے اراکین اور سربراہوں تک کے انتخاب میں شورائیت اور جمہوریت کی روح کو جاری و ساری کیا گیا۔ اس طرح عام اراکین میں خود اعتمادی' احساس ذمہ داری اور شراکت کی قدروں کو فروغ ملا۔ یہ ابتلا و آزمایش کے دور کے آغاز کے بعد سے جماعت میں پہلی بار ممکن ہوا (ہفت روزہ المجتمع' کویت' شمارہ ۱۱۸۶' ۳۰ جنوری ۱۹۹۶' ص ۲۲)۔

۱۹۹۱ میں اخبار الاہرام کے ایک ذیلی ادارے سنٹر فار پولیٹیکل اینڈ اسٹرے ٹیجک اسٹڈیز (مرکز برائے سیاسی و استراتیجی مطالعات) نے مصر کے سیاسی و سماجی حالات پر ایک معروضی تجزیہ پیش کیا۔ اس رپورٹ میں ملک میں بڑھتے ہوئے رجحانات "تشدد و دہشت گردی پر بے چینی ظاہر کی گئی ہے اور اسلام پسندوں کی روز افزوں مقبولیت اور اخوانی کارکنوں کے عوامی اثرات پر اضطراب کا اظہار کیا گیا ہے۔ رپورٹ سے

اندازہ ہوتا ہے کہ استاذ ابوالنصرؒ کے دور میں اخوان پھر مرجع خلائق بننے لگے۔ رپورٹ میں انجمن اطبا' انجینیرز ایسوسی ایشن' طلبہ یونین اور تنظیم اساتذہ جیسی پیشہ ورانہ تنظیموں اور انجمنوں کے انتخابات میں اخوانیوں کی کامیابی کا جائزہ لیا گیا ہے۔

آٹھویں عشرے کے نصف آخر سے انجمن اطبا مصری معاشرے میں سب سے متحرک اور فعال انجمن باور کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ ایک تو ملک میں سیاسی' معاشی اور معاشرتی ارتقا ہے اور دوسری وجہ تحریک اسلامی کے بڑھتے ہوئے اثرات ہیں۔ ۷۸-۱۹۷۷ میں تحریک اسلامی کے جن طلبہ نے کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں قیادت کی اور پیشہ ورانہ کالجوں میں اپنے اثرات قائم کیے' وہی طلبہ آج تمام پیشہ ورانہ انجمنوں میں قائدانہ کردار نبھا رہے ہیں۔ آج معاشرے کے تمام ادارے قانون کے دائرے میں رہ کر کام کر رہے ہیں اور ملکی دستور کی حدود میں اپنی سرگرمیاں انجام دے رہے ہیں۔ ان تمام پیشہ ورانہ انجمنوں کو قانون نے تحفظ فراہم کیا ہے۔ وہ ڈاکٹروں کے درمیان مشترک افکار و اقدار کی اشاعت و استحکام اور ممالک عربیہ کی دوسری طبی انجمنوں سے تعاون کے لیے مصروف تگ و تاز رہ سکتی ہیں تاکہ صحت کا معیار بلند ہو اور آزادی وطن' ترقی معاشرت اور وحدت عربیہ کے مقاصد کا حصول ممکن ہو سکے۔ نیز مصری ڈاکٹروں کا دنیا کے دوسرے ڈاکٹروں سے رابطہ بہتر اور مضبوط ہو۔ یہ قانون ۱۹۶۹ میں بنایا گیا تھا اور اشتراکی عناصر نے اس سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ انجمن اطبا پر اسلامی عناصر کے غلبے کی وجہ سے بڑے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ انجمن اطبا کے انتخابات میں اراکین کی دلچسپی کافی بڑھی ہے۔ ۱۹۸۲ میں ووٹ دینے والوں کا تناسب ۴ فی صد' ۱۹۸۴ میں ۱۸ فی صد اور ۱۹۸۶ میں ۱۷ فی صد تھا۔ بعد کے انتخابات میں ۱۹۸۸ اور ۱۹۹۰ میں یہ تناسب بڑھ کر ۲۵ فی صد اور ۲۵.۵ فی صد ہو گیا۔

انجمن اطبا کے منتخب اراکین کی غالب اکثریت اسلامی رجحان رکھتی ہے اور وہ اس کی تمام ذیلی کمیٹیوں پر حاوی اور غالب ہے' جیسے معاشرتی کمیٹی' تمام یونٹوں کی کمیٹی' مصر کے باہر اطبا کی کمیٹی' حفظان صحت کمیٹی' کمیٹی برائے نشرواشاعت' امانۃ کمیٹی' ہیلتھ انشورنس کمیٹی وغیرہ۔ انجینیرز ایسوسی ایشن کا بھی یہی حال ہے۔ اس کی تمام ذیلی کمیٹیوں پر اسلام پسند چھائے ہوئے ہیں۔ سیکرٹریٹ' انتظامیہ اور دوسرے مرکزی یونٹوں کے علاوہ صوبوں اور شہروں کی سطح پر ۲۴ کمیٹیوں میں یہی لوگ برتری حاصل کیے ہوئے ہیں۔

رپورٹ کے مطابق بیشتر مصری یونی ورسٹیوں کی طلبہ یونینوں میں اسلامی رجحان کا غلبہ ہے۔ یہ تمام طلبہ ۱۹۷۹ کے دستورالعمل کی منسوخی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ وہ ۱۹۷۶ کا دستورالعمل بحال کرنا چاہتے ہیں جو خود طلبہ یونینوں کا تشکیل کردہ ہے۔ ۱۹۹۱ کے انتخابات میں قاہرہ یونی ورسٹی کے سائنس کالج' میڈیکل کالج' انجینیرنگ کالج اور معاشرتی منصوبہ بندی کالج کی تمام سیٹوں پر اسلام پسند کامیاب ہوئے' جب کہ وٹرنری کالج' کالج آف ایگریکلچر' کالج آف آرکیالوجی اور آرٹس کالج میں بھاری اکثریت سے' اور کالج آف

اکنامکس' کالج آف پولیٹیکل سائنس' کالج آف فارمیسی' ڈینٹل کالج اور کالج آف کمیونی کیشن میں ایک تہائی یا دو تہائی نشستوں کے حصول کے ساتھ وہ فتح یاب رہے۔ جامعہ الازہر میں تو اسلام پسندوں کے تمام امیدوار فاتح نکلے اور الحزب الوطنی کے امیدوار حمایت حاصل کر کے ہی کامیاب ہو سکے۔

ماضی قریب میں' رپورٹ کے مطابق' یونی ورسٹیوں کی تنظیمات اساتذہ کی سرگرمیاں کافی وسیع ہوئی ہیں۔ انھوں نے اساتذہ کے مسائل کے ساتھ معاشرے کے امور و معاملات میں بھی بڑی دلچسپی لی ہے۔ گذشتہ ۳ برسوں سے ان تنظیموں کی عام کانفرنس منعقد ہو رہی ہے اور ہر ۲ ماہ پر قاہرہ' ازہر' عین شمس' حلوان' بنہا' طنطا' المنصورہ' الزقازیق' قناۃ السویس (نہر سویز)' المنیا' اسیوط' الاسکندریہ اور المنوفیہ کی یونی ورسٹیاں باری باری یہ کانفرنس منعقد کرتی ہیں۔ بیش تر یونی ورسٹیوں کی تنظیم اساتذہ میں مختلف عہدوں پر اسلام پسند ہی فائز ہیں (لجنة من المتخصصين باشراف مصطفى محمد الطحان' حاضر العالم الاسلامی عام ۱۹۹۲ م' المرکز العالمی للکتاب الاسلامی' کویت' ۱۹۹۴' ص ۹۹-۱۰۱)۔

۱۹۹۵ میں پارلیمانی انتخابات سے قبل ہی صدر حسنی مبارک نے اخوان کے ساتھ پکڑ دھکڑ کا معاملہ کیا اور تمام دستوری و قانونی تقاضوں کو بالاے طاق رکھ کر بیشتر اخوانی رہنماؤں کے خلاف فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا۔ ۵۴/ قائدین کو ان مقدموں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سے ۵/۱افراد کو ۵ سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی اور ۴۹/۱اخوانیوں کو ۳' ۳ سال قید کی سزا دی گئی' جب کہ ۲/۷افراد کو بری کر دیا گیا۔ مرکز کی عمارت کو ۱۸ برسوں سے مسلسل سرگرم عمل اور آباد رہنے کے بعد مقفل کر دیا گیا اور تمام مقبوضہ اشیا کو ضبط کر لیا گیا۔ یہ اہم واقعہ بھی تاریخ مصر اور تاریخ اخوان دونوں میں محفوظ کیے جانے کے قابل ہے کہ پہلی بار اس مقدمے میں ملک کے مختلف طبقوں اور تمام حزب اختلاف سے تعلق رکھنے والے ۳۵۰ وکیلوں نے دفاع اخوان کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا۔ فوجی عدالت کے اس فیصلے کے بعد نائب مرشد عام نے ایک انٹرویو میں صورت حال کی وضاحت کی اور صدر حسنی مبارک کے اس اقدام کو تحریک اسلامی کے لیے ابتلا و آزمایش کے تسلسل سے تعبیر کیا۔ یہاں اس انٹرویو کے بعض حصے درج کیے جا رہے ہیں:

المجتمع: کیا حکومت سے بات چیت کا دروازہ بند ہو چکا ہے یا حالات کو معمول پر لانے کے لیے ابھی کوئی اس قسم کی گنجایش موجود ہے؟

نائب مرشد عام: سیاسی سطح پر ہمارے اور حکومت کے درمیان ابھی کوئی گفتگو نہیں ہوئی ہے۔ البتہ ہماری خواہش ہے کہ باہمی گفت و شنید ہو۔ پولیس کے بعض ذمہ داروں سے گفتگو ہوتی رہی ہے۔ وہ اچھی طرح واقف ہیں کہ ہم تشدد اور دہشت گردی سے بہت دور ہیں اور ہم کسی قیمت پر اسے پسند نہیں کریں گے کہ ہماری طرف سے حکومت کو امن عامہ کے مسائل درپیش ہوں۔ البتہ ارباب حکومت نے اس یلغار کے بعد ہم پر دہشت گردی اور انتہا پسندوں سے سازباز رکھنے کا الزام عائد کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس سے

حکومت کا انداز گفتگو بدلتا محسوس ہو رہا ہے، جب کہ خود صدر مملکت حسنی مبارک نومبر ۱۹۹۳ء میں فرانسیسی اخبار لی مانڈے کو دیے گئے انٹرویو میں اعتراف کر چکے ہیں کہ: "اخوان سیاسی جنگ کو ترجیح دیتے ہیں اور انھوں نے ٹریڈ یونینوں کے انتخابات میں حصہ لیا اور کامیاب ہوئے"۔ اس وقت کے وزیر داخلہ حسن الفی نے بھی اپریل ۱۹۹۴ء میں تشدد اور دہشت پسندی سے اخوان کے تعلق پر پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ: "اخوان کا تشدد سے کوئی تعلق نہیں ہے"۔ مگر اب حکومت اخوان اور دہشت پسند جماعتوں کے درمیان رابطے کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہی ہے۔

المجتمع: حکومت کی اس الزام تراشی کو اور اخوان اور دہشت پسندانہ سرگرمیوں میں ملوث جماعتوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کرنے کی حکومتی پالیسی کو آپ کس تناظر میں دیکھتے ہیں؟

نائب مرشد عام: میرا خیال ہے کہ "اسلامی بنیاد پرستی" "اسلامی تشدد پسندوں" اور "اسلامی انتہا پسندوں" وغیرہ اصطلاحات کے پس پردہ یہودیوں کا ہاتھ ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اخوان اور عام طور سے تمام اسلام پسند، امام حسن البناؒ کے زمانے ہی سے فلسطین پر یہودی تسلط کے خلاف ہیں۔ اس مبالغہ آرائی اور افسانہ تراشی کے ذریعے یہودی امریکہ، یورپی ممالک اور بعض عرب ممالک کے حکمرانوں کو مطمئن کر دیتے ہیں۔ وہ خلاف واقعہ باتوں کو نمک مرچ لگا کر بیان کرتے ہیں اور اخوان جیسی اعتدال پسند جماعتوں اور انتہا پسند تنظیموں کو ایک دوسرے سے خلط ملط کر دیتے ہیں اور مصر اور دوسرے علاقوں میں اخوانیوں کو کچلنے لگتے ہیں۔

المجتمع: اخوان اور مصری حکومت کے درمیان تعلقات کی نوعیت مستقبل میں کیا ہو گی اور آپ اس سلسلے میں کیا حکمت عملی اختیار کریں گے؟

نائب مرشد عام: پارلیمانی انتخابات کے بعد ہی حکومت کی پالیسی واضح ہو سکے گی۔ اگر حکومت مستحکم ہوئی اور اسے حزب اختلاف کی موجودگی سے کوئی پریشانی محسوس نہ ہوئی تو ممکن ہے کہ حکومت کچھ نرم پڑے ورنہ وہ اخوان کو تنگ کرے گی۔ حکومت سے تصادم کی صورت میں ہم اپنی طرف سے پوری صراحت کرنا چاہتے ہیں کہ ہم تصادم اور معرکہ آرائی کا راستہ اختیار نہیں کریں گے۔ ہماری طرف سے کسی تشدد کا استعمال نہیں ہو گا مگر ہم دستور کی حدود میں رہ کر اور قوانین حکومت کا لحاظ کرتے ہوئے تمام وسائل و ذرائع کے ساتھ دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دیتے رہیں گے۔ ہم دعوت دین کا کام کریں گے۔ اسلامی تعلیمات کی طرف لوگوں کو بلائیں گے اور جس قدر مواقع ہمیں میسر ہیں، نفاذ شریعت کی مہم جاری رکھیں گے مگر دہشت اور قوت کے استعمال اور افواہوں کی گرم بازاری سے پرہیز کریں گے۔ اگر حکومت ان چیزوں میں دلچسپی لے گی تو اس کی خود ذمہ دار ہو گی۔

آخر میں ہم یہ واضح کرنا چاہیں گے کہ ہماری تمام تر جدوجہد اس لیے ہو گی کہ عالمی معاشرہ اسلام کی

حقیقت سے واقف ہو۔ اسے معلوم ہو جائے کہ یہ سلامتی کا مذہب ہے۔ یہ عدل و انصاف اور رحمت و حریت کا دین ہے، اور یہ کہ اخوان اسلام کے علم بردار ہیں اور وہ چھوٹے بڑے تمام معاملات میں اسلام کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ ہم اس تصویر کو مزید نکھارنے کی کوشش کریں گے، جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ صیہونیوں نے عالم مغرب میں اسلام اور مسلمانوں کی تصویر مسخ کر کے پیش کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ صیہونیت کے علم برداروں نے اسلام کو دہشت اور تشدد کے مذہب کے طور پر پیش کیا ہے، جب کہ سب جانتے ہیں کہ صیہونیت ہی تشدد اور دہشت کی بنیاد ہے۔ ہماری کوشش ہو گی کہ ذرائع ابلاغ صحیح تصویر کشی کریں۔ وحسبنا اللّٰہ ونعم الوکیل (ہفت روزہ المجتمع، کویت، شمارہ ۱۱۷۸، ۵ دسمبر ۱۹۹۵، ص ۳۰-۳۲)۔

استاذ محمد حامد ابو النصرؒ کے دور میں اخوان نے خلیجی ممالک اور عالم اسلام کے مسائل پر بڑا بے لاگ اور جرأت مندانہ موقف اختیار کیا اور تحریک اسلامی کا نقطۂ نظر بے کم و کاست بیان کیا۔ عراق کویت جنگ اور امریکہ کی فوجی مداخلت کے خلاف عالم اسلام میں بڑا ہنگامہ برپا ہوا۔ بعض اسلامی تحریکوں نے امریکہ دشمنی میں عراق کے جارحانہ اقدام کو نظرانداز کر دیا۔ بعض اسلام پسند رہنماؤں نے تو صدر عراق صدام حسین کو مبارک باد بھی دی۔ مگر اخوان کا موقف بڑا معتدل اور باوقار تھا۔ انھوں نے تمام حالات کا گہرا اور سنجیدہ تجزیہ کر کے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کیا۔

استاذ ابو النصرؒ کا پہلا بیان کویت پر عراقی حملے کے دن ۲/اگست ۱۹۹۰ کو ہی شائع ہوا جس میں عراقی جارحیت کی مذمت اور جان و مال کی بڑے پیمانے پر تباہی پر اظہار افسوس کیا گیا تھا۔ بیان میں کہا گیا کہ عراقی فوجیں فوراً کویت کی سرحدوں سے نکل جائیں ورنہ اس کے دور رس اثرات عالم اسلام پر مرتب ہوں گے اور مقبوضہ فلسطین میں جاری اسلامی مزاحمت بہت کمزور ہو جائے گی۔ امت اسلامیہ کے سربراہوں سے اپیل کی گئی کہ عراق کو پسپائی پر آمادہ کرنے کے لیے تمام ممکنہ وسائل اور اثر و رسوخ کا استعمال کریں اور دونوں پڑوسی ملک مل بیٹھ کر اختلافات کا تصفیہ کر لیں۔

استاذ ابو النصرؒ نے ہر قسم کی غیر ملکی مداخلت کا جس میں سرفہرست امریکی مداخلت تھی، مقاطعہ کیا اور تمام غیر ملکی طاقتوں کو اس سے باز آنے کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے زور دیا کہ اس خلیجی بحران کا تصفیہ عرب اسلامی تناظر میں کیا جائے۔ اس سیاق میں اخوان نے عالم اسلام کی مختلف اسلامی تحریکوں کے نمایندوں پر مشتمل ایک وفد تشکیل دیا جس کی قیادت مرشد عام اور ان کے مشیر قانونی مامون الہضیبی نے کی اور اس بحران کو حل کرانے کی کوشش کی۔

دوسرے مرحلے میں، ۲۰ جنوری ۱۹۹۱ کو مرشد عام نے ایک اور بیان جاری کیا، یعنی عراق پر امریکی حملے کے تیسرے دن، آپؒ نے امریکی حملے اور متحدہ فوجی قوتوں کی مذمت کرنے کے ساتھ امت مسلمہ کے اس

بحران کے لیے عرب حکام کو ذمہ دار قرار دیا۔ انھوں نے صراحت کی کہ حاکم عراق اور اس کے بدترین آمرانہ نظام حکومت کو تمام تر قصوروار مان لیا جائے، تب بھی یہ حقیقت تبدیل نہیں ہو سکتی کہ عراقی قوم امت مسلمہ و عربیہ ہی کا ایک حصہ ہے۔

اس مرحلے میں، اخوان برابر عراقی نظام حکومت اور صدام حسین کے آمرانہ مزاج کی مخالفت کرتے رہے اور یہ اعلان کرتے رہے کہ عراق نے عجلت میں حماقت کا مظاہرہ کیا ہے اور اس کے تمام اقدامات سے اسلام دشمنوں کو ہی فائدہ پہنچا ہے۔ یہاں تک کہ اخوان کا کہنا تھا کہ اسرائیل پر عراق نے جو میزائل چھوڑے ہیں، ان سے صیہونیت ہی کا فائدہ ہوا ہے کیونکہ وہ مملکت اسرائیل کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ البتہ اسے باہر سے اربوں اور کھربوں ڈالر کی امداد ضرور مل گئی ہے۔

تیسرے مرحلے میں، اخوان نے جنگ کے خاتمے اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کو عراق کی جانب سے تسلیم کیے جانے پر خوشی و مسرت کا اظہار کیا اور عرب حکومتوں سے درخواست کی کہ وہ اس بحران سے سبق حاصل کریں۔ اپنے یہاں عوام کو آزادی رائے اور حریت فکر سے ہم کنار کر کے صحت مند شورائی نظام قائم کریں۔ مرشد عام نے اس بیان میں زور دیا کہ خلیجی بحران کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہاں کے حکام آمر اور مستبد تھے۔ جمہوریت اور شوریٰ مفقود تھی اور عوام کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں انھیں شریک نہیں کیا گیا تھا (حاضر العالم الاسلامی عدد ۱۹۹۲، حوالہ بالا، ص ۹۷-۹۸)۔

چوتھے مرشد عام استاذ محمد حامد ابو النصرؒ نے ۱۰ سال اخوان المسلمون کی بھرپور قیادت کر کے ۲۹ شعبان ۱۴۱۶ھ مطابق ۲۰ جنوری ۱۹۹۶ کو عالم آخرت کی راہ لی اور قاہرہ کے علاقے نصر میں قطامیہ قبرستان میں مدفون ہوئے۔ جنازے میں لاکھوں انسانوں، سیاسی رہنماؤں، عالمی اسلامی تحریکات کے نمایندوں اور غیر مسلم تبعیوں نے شرکت کی اور اس طرح صلابت و استقامت، ایثار و قربانی اور استحکام و جہاد و مزاحمت کی ۸۳ سالہ تاریخ خاموش ہو گئی (استاذ محمد حامد ابو النصرؒ کی مجاہدانہ شان اور تحریک اسلامی کی راہ میں ثابت قدمی و جاں سپاری کی تفصیل کے لیے ان کی خود نوشت ملاحظہ کیجیے، وادی نیل کا قافلہ سخت جاں، ترجمہ: حافظ محمد ادریس)۔ تجہیز و تکفین سے فراغت کے بعد لاکھوں کے مجمع عام میں مشیر قانونی اخوان المسلمون استاذ مامون الہضیبی نے مرحوم کی خدمات اور مجاہدانہ سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ مرشد عام نے اپنے مرض وفات سے کچھ پہلے اپنے نائب اول مصطفیٰ مشہور کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا اور تمام اخوانی رہنماؤں نے مصر کے اندر اور باہر اس نامزدگی سے اتفاق کر لیا ہے۔ اب ہماری ذمہ داری ہے کہ پانچویں مرشد عام کی قیادت و معیت میں ثبات و استقامت کی نئی تاریخ رقم کریں (ہفت روزہ المجتمع، کویت، شمارہ ۱۱۸۶، ۳۰ جنوری ۱۹۹۶، ص ۲۲)۔

استاذ مصطفیٰ مشہور (پیدایش ۱۹۲۱)

اخوان المسلمون کے پانچویں مرشد عام استاذ مصطفیٰ مشہور نے اپنے پیش رو کے جنازے میں شرکت کرنے والوں اور تعزیتی کلمات کہنے والوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ۲۱ جنوری ۱۹۹۶ کو مسجد رابعہ العدویہ کے قریب پویلین میں مختصر خطاب بھی کیا۔ آپ نے جماعت اخوان کے طریق کار اور دستور العمل پر زور دیا اور کہا کہ جماعت اسلام کامل کی دعوت دیتی ہے۔ عالم گیر اسلامی حکومت کا قیام اس کا نصب العین ہے اور وہ ہر طرح کے تشدد اور دہشت گردی کو مسترد کرتی ہے۔ امام حسن البنا شہیدؒ کا مقصد وطن اسلامی کو ہر غیر ملکی اقتدار سے آزاد کرنا اور اس وطن میں اسلام کی مملکت قائم کرنا تھا۔ اس جدوجہد میں افراد کی عمریں نہیں بلکہ دعوتوں اور تحریکوں کی عمریں دیکھی جاتی ہیں۔ ہم زمانے کی طوالت سے نہیں گھبراتے۔ ہمارے نزدیک اہم بات یہ ہے کہ ہم راہ حق پر گامزن رہیں، رفتار کو تیز تر کر دیں اور ایک نسل سے دوسری نسل تک یہ امانت منتقل کرتے رہیں تا آنکہ حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے۔ ہمیں رضائے الٰہی محرک کو بہرحال سامنے رکھنا ہے اور محض مادی معیارات ہمارے پیمانے نہیں ہو سکتے۔ آپ نے اس عزم کا بھی اظہار کیا کہ ہم بغیر کسی انحراف کے اسی راہ پر چلتے رہیں گے جو ہمیں حسن البنا شہیدؒ نے دکھائی تھی اور ان کے بعد استاذ حسن الہضیبیؒ نے اسی راہ پر ہماری رہبری کی تھی اور ان کے بعد استاذ عمر التلمسانیؒ اور استاذ محمد حامد ابو النصرؒ نے بالترتیب اس پر گامزن رکھا تھا۔ ان شاء اللہ وہی نقوش راہ ہمارے لیے مشعل راہ ہوں گے اور ہم سب پرامید ہیں کہ مستقبل اسلام کا ہو گا (ایضاً، ص ۲۳)۔

استاذ مصطفیٰ مشہور، پانچویں مرشد عام، ڈیلٹا مصر کے مشرقی خطے ضیا القمح کے گاؤں السعدیین میں ۱۹۲۱ میں پیدا ہوئے۔ ۱۷ سال کے ہوئے تو ۱۹۳۸ میں اخوان المسلمون میں شامل ہوئے۔ ثانوی تعلیم کی تکمیل کے بعد قاہرہ منتقل ہو گئے اور کلیتہ العلوم میں داخلہ لے لیا۔ وہاں سے ۱۹۴۳ میں فلکیات اور رصد کاری میں گریجویشن کیا۔ اس کے بعد ملک کی رصد کاری کی فضائیہ میں ایک فضائی رصد کار کی حیثیت میں ملازمت کر لی۔ ۱۹۴۶ میں فلکیات اور رصد کاری ہی میں اعلیٰ تر ڈپلوما بھی حاصل کر لیا۔

مصطفیٰ مشہور نے بھی سنت یوسفیؑ کی پیروی میں اخوان المسلمون کے دوسرے رہنماؤں اور مرشدین کی طرح قید و بند کی طویل زندگی گزاری۔ ۴ مرتبہ آپ کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیلا گیا۔ پہلی بار ۱۹۴۸ میں السیارۃ الجیب کے معروف کیس میں مقدمہ چلا اور ۳ سال تک آپ زنداں میں بند رہے۔ ۱۹۵۱ میں رہائی ملی۔ ناصری دور میں جنوری ۱۹۵۴ میں دوبارہ قید کر لیے گئے مگر جلد ہی رہا کر دیے گئے۔ اسی سال اگست میں پھر محبوس کر لیا گیا اور ۱۰ سال قید کی سزا دی گئی۔ ۱۹۶۴ میں جیل سے باہر آئے مگر ۱۹۶۵ میں ایک بار پھر اقتدار وقت کی پیشانی شکن آلود ہوئی اور شیخ کو مزید ۶ سال کی قید کا انعام ملا۔ ۱۹۷۱ میں تمام مراحل ابتلا سے کامیابی سے گزر کر آپ نے جیل سے باہر قدم نکالا۔ اس طرح شیخ مصطفیٰ مشہور نے شاہ فاروق اور جمال عبدالناصر کے دور میں مجموعی طور پر ۱۹ سال اسیری کے بسر کیے۔ ۱۹۸۱ میں جب اخوان ایک

بار پھر داروگیر کی آزمایشوں سے دوچار ہوئے تو آپ اس وقت مصر سے باہر تھے۔ چنانچہ کئی سال تک آپ کو جلاوطنی اور ملک بدری کی زندگی گزارنی پڑی۔ ۱۹۸۶ میں وطن واپسی ہوئی۔ اسی سال استاذ محمد حامد ابوالنصرؒ اخوان کے چوتھے مرشد عام منتخب ہوئے تھے۔ شیخ مصطفیٰ مشہور، مرشد عام کے نائب اول مقرر ہوئے اور ان کی پوری مدت امارت میں یہ ذمہ داری پورے اخلاص اور یکسوئی سے نبھائی۔ آخرکار ۱۹۹۶ میں پانچویں مرشد عام کی حیثیت میں اخوان نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی (ایضاً، ص ۲۴)۔

پانچویں مرشد عام کی حیثیت میں استاذ مصطفیٰ مشہور سے مجلہ المجتمع کے نمایندے نے ایک طویل انٹرویو لیا۔ اس کے بعض حصے یہاں نقل کیے جا رہے ہیں جس سے مرشد عام کے خیالات اور آیندہ کی تحریکی حکمت عملی پر روشنی پڑتی ہے۔

احمد منصور: قانونی پابندی اور رنج و محن کے جاں گسل دور سے نکلنے کے لیے اخوان نے کیا کیا؟

مصطفیٰ مشہور: ہم کوشش کر رہے ہیں کہ کوئی ایسا دروازہ وا ہو جائے جس سے ہم اپنی دعوت اور نظریے کی علانیہ تشہیر کر سکیں۔ یہاں میں یہ صراحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم ملکی دستور کے مخالف نہیں ہیں۔ جب ہم صحیح اسلام کی اور شریعت اسلامیہ کی تنفیذ کی دعوت دیتے ہیں تو اس سے دستور کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ کیونکہ مصری دستور اسلام کو ملک کا سرکاری مذہب قرار دیتا اور اسلامی شریعت کو قانون سازی کا ماخذ تصور کرتا ہے۔ یہ محض اخوان کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ یہ تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اسلامی مقاصد کو بروے کار لائے۔ اسلام صرف عبادت کا نام نہیں۔ یہ مذہب بھی ہے اور حکومت بھی۔ اس مذہب کے لیے ایک ایسی مملکت ناگزیر ہے جو اسلام کو نافذ کرے، دشمنان خدا سے مسلمانوں کا تحفظ کرے اور اغیار کی ہر چال کو ناکام بنائے۔ یہ ایک فریضہ ہے لیکن بیشتر مسلمان اس سے غافل ہیں۔ اخوان انھیں اس فریضے کی ادائیگی اور اسلامی شریعت کی تنفیذ کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر حکومتیں شریعت کو نافذ کرنے لگیں تو اخوان ان کے مددگار اور سپاہی ہوں گے۔

احمد منصور: کیا اخوان سیاسی اور قانونی سطح پر اپنا وجود منوانے کے لیے کچھ اقدام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ ۱۹۵۴ سے جماعت خلاف قانون چلی آ رہی ہے۔ کیا کوئی متبادل قانونی شکل سوچی جا رہی ہے؟

مصطفیٰ مشہور: ہم نے سرکاری سطح پر اخوان کے وجود کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اخوان کو خلاف قانون قرار دینے کا کوئی فیصلہ نہیں ہے۔ ہم نے اس مسئلے کو پارلیمنٹ میں رکھا ہے اور یہ زیر غور ہے۔ ۱۹۸۴ کے انتخابات میں ہم نے ایک پارٹی کے قیام پر گفتگو کی تو ہم سے کہا گیا کہ کسی مذہبی سیاسی پارٹی کے قیام کی اجازت نہیں دی جا سکتی کیونکہ اس سے فرقہ وارانہ فساد بھڑک اٹھے گا حالانکہ یہ خلاف واقعہ ہے۔ مسیحیوں سے ابتدا ہی سے ہمارے تعلقات اچھے چلے آ رہے ہیں۔ امام حسن البناؒ، استاذ حسن اسماعیل الہضیبیؒ، سید عمر تلمسانیؒ، استاذ محمد حامد ابوالنصرؒ، ہر ایک کے دور میں بہترین روابط رہے

ہیں۔ اس کی گواہی خود قبطی دیتے ہیں مگر اس کے باوجود حکومت فرقہ وارانہ فساد کا موہوم اندیشہ ظاہر کرتی ہے۔ تاہم بعض اخوانی نوجوانوں نے "الوسط پارٹی" تشکیل دی اور اس کا پروگرام بنایا اور پولیٹیکل پارٹیز افیرز کمیٹی کے سامنے اپنی درخواست پیش کی جسے وہ لازماً نامنظور کر دے گی۔ مگر ہماری خواہش ہے کہ حکومت سے گفت و شنید کریں اور کوئی راہ نکلے' جب کہ ہم تشدد اور دہشت گردی سے دور ہیں اور قوانین ملکی کے خلاف کوئی کام نہیں کرتے۔ اس کے باوجود ہم قید و بند اور مختلف مظالم و مقدمات کا سامنا کرتے رہتے ہیں اور انتخابات میں امیدواری کے ہمارے کاغذات رد کر دیے جاتے ہیں۔

احمد منصور: بعض اخبارات اور میڈیا میں یہ تاثر دیا گیا ہے کہ نئے مرشد عام کا اخوان کے "نظام خاص" میں کلیدی کردار تھا' اب ان کے انتخاب سے اخوان کے نظام عمل اور طریقہ کار میں نیا تغیر آئے گا اور ہو سکتا ہے کہ جماعت اگلے مرحلے میں تشدد آمیز راہ عمل اختیار کرے؟

مصطفی مشہور: اخوان کا پروگرام' ان کا منہاج اور اسلوب' قیادت کی تبدیلی سے نہیں بدلا کرتا۔ اخوان کے سابقہ "نظام خاص" سے میرا رابطہ تھا مگر وہ فلسطین میں یہودیوں کے خلاف جنگ و قتال اور مصر میں انگریزی تسلط کے خاتمے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ ان دونوں محاذوں پر "نظام خاص" نے کلیدی کردار ادا کیا۔ اب وہ دور گزر چکا ہے۔ اس کا یہ مطلب نکالنا غلط ہو گا کہ میں تشدد' طاقت یا اس طرح کی کسی چیز پر یقین رکھتا ہوں۔ اللہ جانتا ہے کہ میں ان طریقوں سے یکسر دور رہا ہوں مگر وہ اس وقت کے مخصوص حالات تھے۔ اب یہ پروپیگنڈا اس لیے کیا جا رہا ہے تاکہ تصویر گھناؤنی بن جائے اور لوگ متنفر ہو جائیں۔ ساتویں عشرے میں جیل سے نکلنے کے بعد ملک میں بڑے حادثات ہوئے مگر کوئی ایک اخوانی بھی الحمدللہ اس میں شامل نہ ہوا۔ ان حقائق کے باوجود ارباب حکومت ہم پر یہ الزامات لگاتے رہتے ہیں کہ الجماعۃ الاسلامیۃ اور تنظیم الجہاد سے ہمارا رابطہ ہے۔ مگر یہ الزامات کبھی ثابت نہیں ہوئے اور فی الحقیقت ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں بلکہ ہم نے ان تمام حادثوں میں تشدد پر تنقید کی ہے (ایضاً' ص ۲۴-۲۶)۔

استاذ مصطفیٰ مشہور ایک کہنہ مشق ادیب و مصنف' صحافی اور خطیب بھی ہیں۔ دسیوں کتابیں تحریک اور داعیان اسلام کے مسائل پر تحریر کی ہیں۔ اخبارات و جرائد میں آپ کے سیکڑوں مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ مصر اور بیرون مصر اسلامی کانفرنسوں اور سیمی ناروں میں اسلام کی بے باک ترجمانی کرتے رہے ہیں۔ طریق الدعوۃ اور زاد علی الطریق میں تحریک اسلامی کے اندر فکری انحرافات اور عملی ابتلاؤں پر بڑا بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے۔ استاذ کے نزدیک:

> راہ دعوت کے انحرافات' داعیان دین کے لیے آزمایشی گھاٹیوں سے زیادہ خطرناک ہیں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ فکری انحراف' حرکی و عملی انحراف سے زیادہ پرخطر ہے۔ کیونکہ فکر صحیح کے سایے میں اس بات کا امکان ہے کہ حرکت اور عمل کو صحیح رخ پر گامزن کر سکیں اور خطا سے دست کش ہو جائیں

لیکن یہ انحراف فکر میں ہو تو اس فکر سے جنم لینے والی ہر حرکت ضرر رساں ہو گی۔ وہ قطعی مفید نہیں ہو گی (مصطفیٰ مشہور، طریق الدعوۃ، الاتحاد الاسلامی العالمی للمنظمات الطلابیہ، کویت، ۱۹۸۰، ص ۸۰)۔

استاذ مصطفیٰ مشہور نے دعوت دین کی راہ میں جن فکری انحرافات کی طرف اشارہ کیا ہے ان میں سب سے اہم قضیہ "تکفیر" ہے۔ یعنی اسلام کے حرکی و انقلابی تصور کو نہ ماننے والوں اور اس کے تقاضوں کی تکمیل سے غفلت برتنے والوں کو کافر، جاہلی یا مشرک قرار دینا۔ اس مسئلے پر اخوان کے دوسرے مرشد عام حسن اسماعیل الہضیبیؒ نے تفصیل سے کلام کیا تھا مگر ان کی پوری گفتگو فقہی اور قانونی پس منظر میں تھی۔ پانچویں مرشد عام نے اس مسئلے پر دعوتی اور سماجی تناظر میں طریق الدعوۃ (حوالہ بالا) میں تفصیل سے بات کی اور اس کے دلائل دیے۔ ان کی یہ طویل بحث مندرجہ ذیل نکات میں سمیٹی جا سکتی ہے:

۱- دوسروں کے ایمان و اسلام کے بارے میں فیصلہ دینا، کسی مسلمان پر واجب نہیں (ص ۵۹-۶۰)۔

۲- ہر مسلمان کی جان و مال اور عزت و آبرو محترم ہے، اسے تار تار کرنے کا کسی کو حق نہیں (ص ۶۰)۔

۳- راہ حق کی آزمایشیں انسانی غلطیوں کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ سنت الٰہی کا حصہ ہیں (ص ۶۱-۶۴)۔

۴- کفر کے فتوؤں سے عام مسلمانوں میں تنفر اور وحشت پیدا ہوتی ہے اور وہ دعوت کے دشمن بن جاتے ہیں (ص ۶۶-۶۷)۔

فاضل مصنف نے اس فکری انحراف کے اسباب و عوامل اور مظاہر بھی گنائے ہیں اور ان پر مفصل گفتگو کی ہے۔ وہ اہم عوامل مندرجہ ذیل ہیں:

(الف) **علم اور اس کے خطرات**: بسا اوقات سطحی اور سرسری علم حاصل کر کے داعی مفتی بن بیٹھتا ہے۔ محض چند نصوص کو دانتوں سے پکڑ لیتا ہے اور ان کے ظاہری مفہوم سے اس طرح چمٹ جاتا ہے کہ ان نصوص کی تعبیر و تشریح کرنے والے علما و فقہا کے ادراکات و استنباطات کو بے معنی قرار دے دیتا ہے۔

(ب) **اصول اور فروع میں عدم امتیاز**: کبھی کبھی سالک دعوت کی روح اور جوہر سے بے نیاز ہو کر ہیکل اور شکل سے ہی لپٹ جاتا ہے، یا جوہر سے پہلے شکل و صورت پر زور دیتا ہے۔ اسی طرح اصول کے بجائے فروع کی دعوت دینا بھی بڑا مہلک ثابت ہوتا ہے۔

(ج) **تفریط اور تشدد**: عبادات و طاعات میں ضرورت سے زیادہ انہماک اور دوسرے فرائض سے غفلت انسان کو یک رخا، مردم بیزار اور متوحش بنا دیتی ہے اور وہ نوافل و سنن کی خاطر فرائض و واجبات کو ترک کرنے لگتا ہے۔

(د) **عجلت اور بے صبری**: راہ حق کے مصائب سے گھبرا کر داعی دین کبھی شارٹ کٹ ڈھونڈنے لگتا

ہے اور قوت و ہتھیار کے استعمال پر آمادہ ہو جاتا ہے جس سے تحریک اسلامی کی راہ کھوٹی ہو جاتی ہے۔

(ہ) **تربیت کے بجائے سیاسی طریقے پر زور:** یعنی تربیت و تزکیے کی مشکل راہ کو چھوڑ کر سیاسی پارٹیوں کی راہ پر داعی گامزن ہو جائے۔ ایمان و اسلام کے اصولوں کو بالائے طاق رکھ دے اور غلبہ و فتح کے لیے تمام اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنے لگے۔

(و) **اشخاص اور قائدین پر انحصار:** تحریک میں اصل اہمیت اصولوں اور عقائد و نظریات کی نہ رہ جائے بلکہ تحریک افراد کے گرد گھومنے لگے اور سارے پروگراموں کی کامیابی کا انحصار شخصیات پر ہو جائے (ایضاً، ص ۴۰-۴۷)۔

ان فکری انحرافات اور عملی آزمایشوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے فاضل مرشد عام نے صحیح راہ کا تعیین بھی کیا ہے:

> اگر ہم واقعی یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کے لیے خیر و امن اور سعادت کی تحصیل کریں اور اس سرزمین پر دین الٰہی کو غلبہ و تمکن سے ہم کنار کریں، تو ہمارے لیے لازم ہے کہ اسی راہ پر گامزن ہوں جس پر اللہ کے رسول چلے تھے۔ یعنی ایمان و عمل اور محبت و اخوت کی راہ۔ اس میں کوئی تبدیلی و تغیر نہ ہو اور نہ کوئی افراط و تفریط ہو (ایضاً، ص ۶۷، نیز دیکھیے ص ۱۰۹-۱۱۰)۔

استاذ مصطفیٰ مشہور کی ہوش مند قیادت، باوقار حکمت عملی اور متین و سنجیدہ افکار و نظریات کے اثرات و نتائج کو عالم اسلام اور مصر کے مورخین ضرور محسوس کریں گے۔ ان کے نظریات کی پختگی اور تحریروں کے رسوخ و استحکام پر تیسرے مرشد عام السید عمر تلمسانیؒ نے بڑا جامع تبصرہ کیا ہے:

> ہر علم کا ایک فہم اور فقہ ہے جس کا حامل و طالب اس علم کے ناگزیر عناصر کا ادراک کرتا ہے۔ احکام القرآن کی ایک فقہ ہے۔ سنت مطہرہ کی اپنی فقہ ہے اور سیرت نبویؐ کی اپنی فقہ۔ اسی طرح دین کی دعوت و اصلاح کی ایک فقہ ہے اور اس علم کی گہرائیوں اور ناگزیر عناصر کا وہی ادراک کر سکتا ہے جسے اللہ نے دین، علم اور اخلاص کی دولت سے نوازا ہو۔ دین سے ایمان آتا ہے، علم سے وضاحت و صراحت کی تکمیل ہوتی ہے اور اخلاص سے عمل کو کامیابی ملتی ہے۔
>
> اللہ کی مشیت ہوئی کہ بھائی مصطفیٰ مشہور پر احسان کرے۔ اس نے انھیں دعوت الی اللہ اور آزمایش میں ثبات علی الحق کے لیے منتخب کرلیا۔ وہ اپنے احباب کے ساتھ ان آزمایشوں سے نکلے تو ثابت قدم، ٹھوس، پاکیزہ و مطہر اور مخلص و متجرد للہ تھے (ایضاً، ص ۵)۔

تذکرہ سید مودودی: ۲، ۳

ایک مطالعہ

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ٥

بیسویں صدی کا سورج طویل مسافت طے کرنے کے بعد، غروب ہونے والا ہے۔

ایک سو سال کے سفر میں اس نے کیا کچھ نہیں دیکھا: قوموں کا عروج و زوال، تحریکوں کا نشیب و فراز، شخصیات کی آمد و رفت، نظریات کی آویزش و کش مکش، دو عظیم جنگوں اور بعض انقلابات کے نتیجے میں بے مثال خون ریزی و غارت گری، ہجرتیں اور انسانیت کی تباہی و بربادی وغیرہ------ رواں صدی اس اعتبار سے منفرد ہے کہ چشم فلک نے اتنے قلیل عرصے میں، بساط عالم میں رونما ہونے والی، ایسی بڑی تبدیلیاں اور اتنی کثیر تعداد میں انقلابات، کم ہی دیکھے ہوں گے۔

تاریخ میں شاید ہی اتنی بڑی تعداد میں قوموں اور ملکوں کو آزادی نصیب ہوئی ہو گی جس قدر بیسویں صدی میں ملی۔ افریقہ اور ایشیا کے دسیوں خطے برطانوی، فرانسیسی، ولندیزی، پرتگالی اور روسی سامراج سے آزاد ہوئے، مگر تاریخ کے اوراق الٹتے ہوئے، قاری رہ رہ کر ایک گہرے تاسف سے دوچار ہوتا ہے اور وہ یہ کہ یہ ظاہری آزادی ان اقوام کی حقیقی آزادی کا پیش خیمہ نہ بن سکی۔ سیاسی طور پر تو انھیں آزادی مل گئی مگر ذہن بدستور غلام رہے۔ اس ذہنی غلامی کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ دوسروں کی طرح، ہم برعظیم کے مسلمان بھی ابھی تک اس سے نجات نہیں پا سکے۔

ذہنی غلامی کے دور رس اور گہرے اثرات کا حقیقی ادراک بیسویں صدی میں جن مسلم اکابر نے کیا، ان میں علامہ اقبالؒ (۱۸۷۷ـ۱۹۳۸) اور مولانا مودودیؒ (۱۹۰۳ـ۷۹) کے نام سرفہرست ہیں۔ ذہنی غلامی کے خاتمے کے بغیر کسی مثبت، تعمیری اور نتیجہ خیز تحریک کا ثمر آور ہونا ممکن نہیں ہے، اس لیے دونوں کی زندگیاں اسی کے خلاف جدوجہد کرتے گزریں۔ علامہ اقبالؒ اور مولانا مودودیؒ کا زمانہ، اسلامی نشات ثانیہ

---

٥ استاد شعبہ اردو، پنجاب یونی ورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور

کی آرزومندی اور اس کے لیے عملی جدوجہد کے لیے حد درجہ ناسازگار تھا۔ ۶۰، ۷۰ سال کا طویل عرصہ گزر جانے پر، آج ہمارے لیے ان حالات کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ گو، علامہ اقبالؒ ایک گہرے ایمانی شعور و جذبے اور تیقن کے ساتھ کہہ رہے تھے:-

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

بایں ہمہ، عوام الناس تو کجا، ہندستان کا جدید اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ بھی ذہنی غلامی سے چھٹکارا نہ پا سکا۔ اس کا اندازہ مولانا مودودیؒ کے ایک دیرینہ قریبی رفیق اور درویش صفت عالم ملک غلام علی مرحوم (وفات: ۲۶ ستمبر ۱۹۹۴) کے روایت کردہ ایک واقعے سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس زمانے میں ملک صاحب اسلامیہ کالج لاہور میں زیر تعلیم تھے۔ مولانا مودودیؒ نے وہاں اعزازی طور پر اسلامیات کا درس دینا شروع کیا تو [ملک صاحب بتاتے ہیں کہ]: ان کی تقاریر سننے کے بعد، میرے قلب و ذہن کی دنیا بدل گئی اور میں نے سلسلۂ تعلیم منقطع کر دیا۔ میرے اساتذہ کو علم ہوا تو اظہار افسوس کرنے لگے اور مجھے بلا بھیجا۔ پروفیسر حمید احمد خاں احساس ملی سے سرشار ایک فاضل دانش ور تھے۔ ایک طرف تو وہ خود کو مولانا مودودیؒ کا مداح قرار دیتے تھے مگر دوسری طرف مولانا کی جدوجہد، ان کے نزدیک ایک کار عبث تھی۔ چنانچہ وہ ملک صاحب کو سمجھانے لگے اور ان سے کہا: He is fighting for a lost cause (وہ [مودودی] ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہے ہیں)۔ اسی طرح ملک صاحب کے ایک اور استاد ڈاکٹر سعید اللہ بھی یہ سمجھتے تھے کہ مولانا مودودیؒ کی دعوت "ویرانے میں چیخ پکار" کے مترادف ہے۔ انھوں نے ملک صاحب سے کہا تھا: That is a cry in the wilderness

خیال رہے کہ یہ اساتذہ مسلمانوں کے ایک بڑے ملی، تعلیمی ادارے اسلامیہ کالج [ریلوے روڈ] سے منسلک تھے، قومی جذبہ رکھنے والے دردمند مسلمان تھے اور علامہ اقبالؒ کے ہاں حاضر باش لوگوں میں سے تھے۔ مگر تعجب ہے کہ اقبالؒ کی انقلاب انگیز شاعری اور ان کی صحبتوں سے فیض یاب ہونے کے باوجود یہ حضرات اسلامی نشاتِ ثانیہ کے لیے مولانا مودودیؒ کی مساعی کو ایک کار لاحاصل سمجھتے تھے۔

بلاشبہ مولانا مودودیؒ نے حد درجہ ناسازگار، اور بڑی حد تک حوصلہ شکن اور مخالفانہ ماحول میں کام کا آغاز کیا۔ یہ ان کی نیک نیتی، خلوص، دردمندی اور محنت و لگن اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم تھا کہ ان کی جلائی ہوئی مشعل، بہ قول اقبالؒ: "بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی" ثابت ہوئی جس نے اِدھر اُدھر بھٹکنے والوں کو ایک راستہ دکھایا، لوگ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ آغاز کار میں وہ تنہا تھے لیکن رفتہ رفتہ رازدانوں کی تعداد بڑھتی گئی اور آج، ان کی وفات کے صرف ربع صدی بعد ان کی فکر اور ان کی آغاز کردہ تحریک اسلامی کے ہمہ گیر اثرات کو، کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے، پوری دنیا میں دیکھا جا

سکتا ہے:؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

مغرب اور اسلام کے درمیان ایک آویزش اور دنیا پر مکمل غلبے کے لیے امریکہ کی حالیہ مجنونانہ کوششوں اور مختلف الاطراف مزاحمت کے پس پردہ' کسی نہ کسی درجے میں مولانا مودودیؒ کے اثرات سے بہرحال انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن مولانا مودودیؒ کون تھے؟--- ان کی شخصیت کیسی تھی؟--- اس کے عناصر' ان کا دعوتی طریقۂ کار' حکمت عملی' ان کی عزیمت' ان کے رفقا' ان کی تحریک کے اہداف' نشیب و فراز اور مجموعی حیثیت سے تقریباً پون صدی کی جاں گسل اور تاریخ ساز جدوجہد کی کہانی' ہمیں حال ہی میں شائع ہونے والے دو ضخیم مجموعوں **تذکرہ سید مودودی** (حصہ دوم اور سوم) میں ملتی ہے۔ ایک ایسی کہانی اور ایک ایسی داستان جو دلچسپ ہونے کے ساتھ سبق آموز بھی ہے اور جسارت آفریں اور جراَت انگیز بھی۔ یہ ہماری ملی تاریخ کا حصہ ہے۔ ایسی تاریخ' جو محض کتابوں کے اوراق میں محفوظ ہو کر رہ جانے والی نہیں ہے' بلکہ یہ پرحرارت اور پرگداز لفظوں کا ایسا کارواں ہے' جو تاریخ کے اوراق سے جھانک جھانک کر قارئین سے مکالمہ کرتا اور انھیں عمل پیہم سے کام لینے اور جہاد زندگی میں سرگرم عمل ہونے کی تلقین کرتا ہے۔ یہ تحریریں بتاتی ہیں کہ وقت کی پکار کیا ہے:؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ یاد رہے کہ ۱۹۸۶ میں **تذکرہ سید مودودی** کا پہلا حصہ (۱۰۰۰ صفحات) شائع ہوا تھا۔ اب اس کا دوسرا حصہ (۸۰۶ صفحات) اور تیسرا حصہ (۹۵۰ صفحات) بہ یک وقت سامنے آئے ہیں جنھیں جناب جمیل احمد رانا اور سلیم منصور خالد نے کمال محنت و کاوش اور دیدہ ریزی سے مرتب اور ادارہ معارف اسلامی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے (قیمت' اول: ۶۰۰ روپے' دوم: ۶۲۵ روپے)۔

تذکرہ سید مودودی مختلف النوع تحریروں پر مشتمل ہے: مقالات' **مصاحبے** (انٹرویو)' تاثرات' نوادرات اور کتابیات وغیرہ وغیرہ۔ بڑی تقطیع کے تقریباً دو ہزار صفحات میں' قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں' کیا کچھ نہیں ہو گا۔

لکھنے والوں میں پروفیسر خورشید احمد' ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری' خرم مراد' اے کے بروہی' الطاف گوہر' مولانا محمد ناظم ندوی' نعیم صدیقی' پروفیسر سید محمد سلیم' چودھری غلام جیلانی' خان محمد ربانی' ڈاکٹر تحسین فراقی' سید فضل معبود' ڈاکٹر سفیر اختر' شیخ عبدالمالک' مولانا جلیل احسن ندوی' مولانا خلیل احمد حامدی' حافظ محمد

ادریس، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، حکیم محمد سعید، شیخ علی طنطاوی، سید ضمیر جعفری، ڈاکٹر ابن فرید، جان محمد بھٹو، اعجاز الحق قدوسی اور بہت سے دوسرے اہل قلم شامل ہیں۔ چودھری غلام محمد کی "تاریخ جماعت اسلامی" ایک مکمل اور مفصل کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح پروفیسر غلام اعظم کا مضمون "مولانا مودودیؒ: شخصیت اور کارنامے" (۲: ۶۳۵-۶۷۳) خواجہ اقبال احمد ندوی کا طویل مضمون "مولانا مودودیؒ: رفاقت اور مشاہدات" (۳: ۸۲۵ - ۹۳۲) مکمل کتابوں کی طرح ہیں۔ میاں طفیل محمد صاحب سے مصاحبہ (۳: ۱۷۷۱-۱۷۷) ایک معرکے کی چیز ہے جس میں مولانا مودودیؒ کی شخصیت، جماعت اسلامی کی تاریخ، اس کی دستوری جدوجہد، پاکستان کا ۵۰ سالہ منظرنامہ، اور خود میاں صاحب کی اپنی شخصیت کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بعض کلیدی نکات سامنے آتے ہیں۔

مولانا مودودیؒ بلاشبہ ایک نابغہ روزگار شخص تھے۔ معاصرت کی دھند چھٹے گی تو ان کی عظیم شخصیت کے دل کش و دل نواز نقوش اور واضح ہوں گے۔ زیر نظر مجلّے میں اس کی متعدد جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ان کے رفقا میں سے میاں طفیل محمد صاحب کو، غالباً ان کی سب سے طویل اور قریب ترین رفاقت حاصل رہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> میری نگاہ میں مولانا مودودیؒ، اس زمانے میں خدا کی زمین پر اسلام کا ایک چلتا پھرتا نمونہ تھے۔ اپنے اخلاق میں، عادات میں، معاملات میں، اپنے ظاہر و باطن میں وہ اسلام کا عملی اظہار تھے۔ مولانا مودودیؒ سے واسطہ پڑنے کے بعد یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ واقعی امت محمدؐ میں ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں، ہو سکتے ہیں اور اب بھی ہیں کہ جنھوں نے شہادت حق کے اس فریضے کو اپنی حد تک اسی طرح انجام دینے کی پوری کوشش کی جس طرح سے نبیؐ نے امت کے سپرد فرمایا (۳: ۱۷)۔

قائداعظمؒ کی وفات کے بعد، مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کے بارے میں، مسلم لیگ کا طرز عمل بہت عجیب و غریب رہا ہے، بایں ہمہ انصاف پسند مسلم لیگی حضرات، مولانا کے عظمت کردار کے ہمیشہ قائل رہے بلکہ اس کا اعتراف کرنے میں بھی انھوں نے کبھی تامل نہیں کیا۔ کنور شفیق اللہ صاحب کانگڑہ کی ضلعی مسلم لیگ کے صدر اور پنجاب کی صوبائی کونسل کے ممبر تھے۔ قرارداد پاکستان کے جلسے (۲۳ مارچ ۱۹۴۰) میں بھی شریک رہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ: اپنے دینی پس منظر کی وجہ سے، میں غلبہ اسلام کے نام پر اٹھنے والی ہر تحریک کی جانب لپکتا رہا، مگر مایوسی ہوتی رہی۔ علامہ مشرقی اور غلام احمد پرویز کا اسیر رہا، مگر قریبی مشاہدے نے ان کی جانب سے دل کھٹا کر دیا، پھر جماعت اسلامی کی طرف راغب ہوا، مگر رائے قائم کرنے میں بہت محتاط رہا۔ جب میں نے جماعت اور اس کے تربیت یافتہ افراد اور قیادت کے کردار کا اچھی طرح مشاہدہ کر لیا اور اطمینان ہو گیا کہ ان کے گفتار و عمل میں کوئی تضاد نہیں، تو میں بالکل یکسو ہو گیا اور یہ وہ موقع تھا کہ جب بڑے بڑے متقیوں کے ایمان متزلزل اور کردار ڈانواں ڈول ہو گئے تھے.....

قیام پاکستان کے بعد مجھے لاہور میں افسر بحالیات مقرر کر دیا گیا۔ ان دنوں افسر بحالیات ہی آخری اتھارٹی ہوا کرتا تھا' وہ جو کر دے' حتمی ہے۔ میرے ذمے مہاجرین کو مکانات اور دکانیں الاٹ کرنا تھا۔ بعض دکانیں بھری پڑی تھیں اور میں اس امر کا مجاز تھا کہ انھیں لونڈ قرار دے کر کسی کو الاٹ کر دوں' خواہ اندر پانچ لاکھ کا مال ہی کیوں نہ پڑا ہو۔ ایک روز میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مولانا میں اس وقت الحمدللہ ایک افسر ہوں۔ جماعت سے تعلق رکھنے والے جتنے بھی مہاجر افراد ہیں آپ انھیں میرے پاس بھیجتے جائیں۔ میں انھیں اچھے کاروباری مراکز میں دو کانیں الاٹ کر دوں گا' اس کے علاوہ بھی کوئی خدمت میرے لائق ہو' بلاتکلف مجھے بتائیں' مجھے آپ کی خدمت کر کے مسرت ہوگی۔ مولانا نے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے مختصر سا جواب دیا: "ضرورت پیش آئی تو میں آپ کو زحمت دوں گا"۔ یاد رہے کہ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ہر آدمی ضرورت مند تھا۔ بڑے بڑے لوگ' اب نام کیا لینا' میرے دفتر کا طواف کرتے تھے' سفارشیں لے کر آتے تھے۔ یہ سفارش کرنے والے بھی مسلم لیگ کے بڑے لوگ تھے جو اپنے عزیز و اقارب' احباب وغیرہ کے لیے بلا کسی ادنیٰ تمیز کے' کہ وہ مستحق ہے یا نہیں' سفارشیں کیا کرتے تھے' لیکن میں نے صرف مولانا مودودیؒ ہی کو ایک ایسا شخص پایا جنھوں نے نہ اپنے لیے کچھ مانگا نہ اپنے رفقا کے لیے۔ ہاں' یاد آیا ایک آدمی میرے پاس مولانا کا دو سطری رقعہ لے کر ضرور آیا جس کا مضمون بس اتنا تھا کہ "یہ صاحب دہلی میں میرے ہمسائے تھے' ان کی وہاں دکان تھی' اگر ان کے لیے آپ کچھ کر سکیں تو حق دار کو اس کا حق مل جائے گا۔ فقط ابوالاعلیٰ" (۲: ۴۳۱)۔

مولانا مودودیؒ کی سوانح میں ان کی جرأت و عزیمت کے متعدد واقعات ملتے ہیں۔ ایک واقعہ میاں طفیل محمد صاحب نے سنایا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ۱۹۵۳ کے مارشل لا میں جب مولانا کو قادیانی مسئلہ لکھنے کے جرم میں سزاے موت سنائی گئی' تو متعلقہ فوجی افسر نے کہا: آپ چاہیں تو اپنی سزا کے خلاف سات دن کے اندر کمانڈر ان چیف سے رحم کی اپیل کر سکتے ہیں۔ یہ سنتے ہی' مولانا کا چہرہ بلامبالغہ انگارے کی مانند تمتما اٹھا اور آپ نے نہایت باوقار لہجے میں جواب دیا:

> مجھے کسی سے کوئی اپیل نہیں کرنی ہے۔ زندگی اور موت کے فیصلے زمین پر نہیں' آسمان پر ہوتے ہیں۔ اگر وہاں میری موت کا فیصلہ ہو چکا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے موت سے نہیں بچا سکتی اور اگر وہاں میری موت کا فیصلہ نہیں ہوا' تو دنیا کی کوئی طاقت میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی (۳: ۵۳)۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی شخصیت ایک ایسے گہرے دریا کی مانند نظر آتی ہے' جس کے بارے میں شاعر نے کہا ہے: "تم کو اس دریا کی گہرائی کا اندازہ نہیں"۔ ایک ایسا گہرا اور پرسکون دریا' جو ایک معتدل رفتار سے مگر بڑی روانی کے ساتھ بہے چلا جا رہا ہے۔ مولانا اپنی طبیعت کے اضطراب' فکرمندی' پریشانی اور صدموں کو بالعموم دوسروں پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ ان کے چہرے پر غصے یا جھلاہٹ کے آثار کم ہی

دکھائی دیتے۔ انتہائی پریشان کن حالات اور صدمہ انگیز موقعوں پر بھی، وہ بالعموم پرسکون رہتے۔ بلا کے متحمل مزاج تھے۔ قریبی عزیزوں کی موت پر بھی انھیں روتے نہیں دیکھا گیا۔ بیگم مودودیؒ نے انھیں ایسے سمندر کی مانند قرار دیا جو کبھی متلاطم نہیں ہوتا (۳: ۱۷۸۔ ۲۱۰)۔ مزید برآں بیگم مودودی اور ان کی بیٹی حمیرا (۲: ۴۴۷۔۴۴۸) کے مصاحبوں (انٹرویو) سے بھی ان کی شخصیت کے بعض ایسے نادر پہلو منکشف ہوتے ہیں جن تک رسائی شاید اور ذریعے سے ممکن نہ تھی، مثلاً: ان کا حکیمانہ مزاج، عملی زندگی میں ان کی حکمت عملی کے بعض پہلو، اہل خانہ اور بچوں سے محبت، انتہائی مشفقانہ طرز عمل، ناز برداری کی حد تک اہل و عیال کی چھوٹی چھوٹی ضرورت کا خیال اور حتیٰ المقدور انھیں پورا کرنے کی کوشش۔ حمیرا مودودی کے بہ قول: "بلامبالغہ وہ اپنے بچوں کی اتنی عزت کیا کرتے تھے، جتنی دوسرے لوگ ماں باپ کی کرتے ہیں"۔ بیگم مودودی کے انٹرویو سے پتا چلتا ہے کہ مولانا نے مقصد زندگی کی خاطر اپنی صحت کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ تحریک ختم نبوتؐ میں گرفتار ہوئے تو جیل سے پرانی پیچش اور السر کی بیماریاں لے کر آئے جنھوں نے آخر وقت تک ان کی صحت کو متاثر رکھا۔ شدید محنت اور رت جگوں نے، ان کی بیگم کے بہ قول، ان کی ہڈیاں تک گھلا ڈالیں، حالانکہ ان کی صحت ایسی قابل رشک تھی کہ انھیں کبھی بخار تک نہ ہوا تھا۔

اگر یہ سوال اٹھایا جائے کہ ہمارا سب سے بڑا المیہ کیا ہے؟ تو اس کا صحیح جواب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ ہم حصول پاکستان کا مقصد پورا نہیں کر سکے۔ وجوہ تو بہت ہیں، مگر یہ تو روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ارباب اقتدار و اختیار (الا ماشاء اللہ) اپنے اوپر اسلام نافذ کرنے والے نہ تھے۔ یہی چیز مسلم لیگ پر مولانا کی تنقید کا سبب بنی تھی۔ کنور شفیق اللہ راوی ہیں کہ مولانا نے ایک موقع پر اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا: "مجھے اس بات میں شک ہے کہ وہ لوگ جنھیں خود اسلام کے بارے میں شرح صدر حاصل نہیں، جو اسلام اور اسلامی نظام کی ابجد سے بھی واقف نہیں، جس جماعت کی قیادت اور صفوں میں کمیونسٹ بھی موجود ہیں، اور قادیانی بھی، وہ اسلام کیسے نافذ کر سکیں گے؟ مجھے تو یوں نظر آ رہا ہے کہ مسلم لیگ کی صفوں میں، جو چند علما نظر آ رہے ہیں، اتنی بڑی بھیڑ میں ان کی آواز اس وقت کوئی نہیں سنے گا" (۲: ۴۲۶)۔ اس سلسلے میں مولانا نے مزید کہا:

میرا گمان یہ ہے کہ چونکہ ملک کی باگ ڈور ایسے ہاتھوں میں ہوگی کہ جن کی عملی زندگیوں کا اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں، اس لیے اسلامی نظام حیات انھیں اپنے لیے گلے کا پھندا نظر آئے گا۔ "چنانچہ وہ اس پھندے سے دور رہنے اور دور رکھنے میں ہی عافیت سمجھیں گے اور اس بات پر مصر ہوں گے کہ اسلام بس وہی کچھ ہے کہ جو وہ سمجھتے ہیں اور یہ کہ مذہب انفرادی معاملہ ہے، اس کا

نظام حکومت سے کوئی سروکار نہیں۔ اب اگر کسی نے یہ یاد دلانے کی کوشش کی کہ آپ نے تو یہ خطہ اسلامی نظام قائم کرنے کے وعدے پر لیا تھا اس لیے یہاں پر اسلامی نظام ہی قائم ہونا چاہیے تو وہ ایسے شخص کو پس دیوار زنداں ہی نہیں ' تختۂ دار پر لٹکانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے (۲: ۲۲۷)۔

کنور شفیق اللہ کہتے ہیں کہ مولانا کی گفتگو سے میں گومگو کی سی کیفیت سے دوچار ہو گیا' قرائن ان کی باتوں کی تصدیق کرتے تھے لیکن سچی بات یہ ہے کہ میری تشفی نہیں ہوئی۔ یہ الگ بات ہے کہ مولانا کی یہ باتیں' قیام پاکستان کے بعد حقیقت ثابت ہوئیں۔

دراصل قیام پاکستان کے مقاصد سے انحراف' ہمارے رہنماؤں کی کوئی نادانستہ غلطی نہیں' بلکہ ایک شعوری حرکت تھی۔ جاگیردارانہ پس منظر رکھنے والی قیادت پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی ریاست بنانے کے لیے آمادہ نہ تھی اور افسرشاہی سے انھیں اس کی تائید مل گئی۔ جناب الطاف گوہر بتاتے ہیں کہ اس زمانے میں ہمارے سینیر افسر' مولانا مودودیؒ کو ایک ایسا اچھا قلم کار اور ایک قابل ذکر مفکر سمجھتے تھے جو "سیاسی مقاصد کے لیے غریب مذہب کو ایکسپلائٹ کر رہا تھا" (۲: ۸۰)۔ ان کے خیال میں اسلام کو مساجد اور مسلمانوں کے شخصی معاملات تک محدود رہنا چاہیے۔ قرآن ذاتی زندگی کے لیے بہت اچھا تھا' لیکن ریاست کے معاملات اور انتظام میں شریعت کے لیے کوئی گنجایش نہیں تھی۔ اجتماعی زندگی کو مغربی اداروں اور قوانین ہی کی ذمہ داری رہنے دی جائے۔ حکومت کو برطانوی طرز کے اداروں کی حدود میں کام کرنا چاہیے--- "مولانا مودودیؒ ایک کنفیوزڈ [پریشان خیال] شخص ہے اور نئی ریاست کے لیے مشکلات پیدا کر رہا ہے۔ اگر یہ دشمن نہیں تو دشمن کا ایجنٹ ضرور ہے" (۲: ۸۱)۔

اس پس منظر میں پاکستان پر یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ قرارداد مقاصد پاس ہوئی' پاکستان اسلامی جمہوریہ قرار پایا اور دستوری اور اصولی طور پر اسے ایک "اسلامی ریاست" تسلیم کر لیا گیا [نہ کہ بہت سے نئے مسلمان ملکوں کی طرح "سیکولر جمہوریہ"] ۔ اس ضمن میں مولانا مودودیؒ اور ان کی اسلامی تحریک کی خدمات اور کاوشیں اظہر من الشمس ہیں اور ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا مودودیؒ کے مخالفین کی طرف سے ان پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے' مثلاً یہ کہ انھیں امریکہ سے امداد ملتی ہے۔ اس سلسلے میں میاں صاحب بتاتے ہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کی تحریک زوروں پر تھی تو غلام غوث ہزاروی اور قادیانی حلقوں کی طرف سے اس الزام کی لہر ایک بار پھر اٹھائی گئی۔ میرے بیٹے محسن فاروق کا ایک ہم جماعت لڑکا' کئی ماہ تک پابندی سے بہ ظاہر محسن کا گہرا دوست بنا رہا اور ہمارے گھر آتا رہا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ایک بڑے قادیانی کا صاحبزادہ ہے اور اسے جاسوسی کی ڈیوٹی پر مامور کیا گیا ہے کہ امریکی امداد کا کوئی سراغ لگانے اور ثبوت فراہم کرنے کی کوشش کرے۔ پتا چلا کہ اس لڑکے نے اپنے مرکز کو یہ رپورٹ دی کہ اگر ان لوگوں کو کہیں سے کوئی امداد

ملتی ہے تو وہ اسے ایندھن کے طور پر استعمال کر لیتے ہوں گے اور ڈالر چولھے میں ہی جلا دیتے ہوں گے کیونکہ ان کے کھانے پینے' پہناوے یا زندگی کی کسی بھی آسایش میں تو اس کا کوئی نشان نہیں ملتا' بلکہ یہ لوگ عسرت سے زندگی بسر کرتے ہیں (۳ : ۱۲۴)۔ ایک انکشاف یہ بھی ہوتا ہے کہ کیا پردہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے؟ کے نام سے پروین رضوی کا جو کتابچہ ملتا ہے' وہ دراصل مولانا مودودیؒ کا تحریر کردہ ہے (۲: ۳۵۷)۔

مولانا مودودیؒ کی سیاسی جدوجہد' ان کی دینی خدمات اور تفسیر قرآن کو تو خاصا سراہا گیا مگر ان کے تصنیفی و تالیفی اور علمی کارنامے کے صحیح تعین قدر کی طرف سنجیدگی سے کم توجہ دی گئی ہے' حالانکہ مولانا مودودیؒ کی تصانیف میں جو تنوع اور جامعیت ہے' اس کی مثال بیسویں صدی کے کسی اور دینی ادیب کے ہاں نہیں ملتی (سیاسیات' قانون' تاریخ' تہذیب' معاشیات' عمرانیات' فقہ' حدیث اور قرآن وغیرہ)۔ مولانا کے اسلوب کا تجزیہ بھی کم ہی کیا گیا ہے۔ زیر نظر تذکرہ کا یہ ایک امتیازی پہلو ہے کہ اس سے مولانا مودودیؒ بیسویں صدی کے ایک منفرد اور بے مثل ادیب اور مصنف کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

جناب خرم مرادؒ نے "ایک ایمان افروز کتاب" کے طور پر خطبات کا تعارف اور تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ مولانا کی کسی تصنیف کے تجزیاتی مطالعے کی پہلی سنجیدہ کوشش ہے جس سے خطبات کی قدر و قیمت' تبلیغ دین میں اس کی اہمیت' اس کے انداز بیان کی دل کشی' تاثیر' اور اس کا سادہ و بامعنی اور پرزور طرز ابلاغ (ایک واضح اور استدلالی جذبے کی حدت' منطق' نفسیات اور اس کے اندر تقابل کا آہنگ) واضح ہوتا ہے۔

جناب اے کے بروہی نے بھی مولانا مودودیؒ کے اسلوب نثر کی طرف اہم اشارے کیے ہیں اور ڈاکٹر ابن فرید نے اپنے قابل قدر مضمون میں مولانا کی نثر اور ان کی علمی و ادبی حیثیت پر کام کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے (۳: ۵۹۴-۶۰۱) [مگر اسی موضوع پر فاروق اعظم کا مضمون سرسری اور معیار سے فروتر ہے]۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ اردو کے سب سے مقبول' اور اس اعتبار سے بڑے مصنف ہیں۔ ان کے تصنیفی کارنامے کے ضمن میں راقم الحروف نے تصانیف مودودیؒ کا ایک کتابیاتی اور اشاعتی مطالعہ پیش کیا ہے' جس میں متن کے تعین کے ساتھ ان کی جملہ تصانیف (complete works) کی بہ وضاحت نشان دہی کی کوشش کی گئی ہے۔ زیادہ تر تحریروں کا زمانۂ تحریر اور زمانۂ اشاعت بھی متعین کیا گیا ہے۔ اس مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ مولانا کے خیالات' مناسب غور و فکر اور تیاری کے بعد ہی تحریر و تصنیف کا روپ اختیار کرتے تھے۔ پھر وہ ہمیشہ اپنی تحریروں پر نظرثانی کا عمل جاری رکھتے تھے اور ان میں ترامیم کرتے رہتے تھے۔ دونوں جلدوں کے آخر میں مولانا کے دست نوشت مسودات کے بعض حصے شامل کیے گئے ہیں (میرے خیال میں hand - written کا ترجمہ "خطی عکس" کے بجائے "دست نوشت" بہتر ہے)۔ ان سے مولانا کی

محنت شاقہ کی عادت ظاہر ہوتی ہے، مثلاً: ابتدائی زمانے میں قوم، قومیت اور قوم پرستی پر مغربی تصورات کا ایک خلاصہ جو Encyclopedia of Religion and Ethics سے اخذ کیا گیا، اپنے بعض مسودات میں ترمیم و تصحیح اور بعض پبلک تقریروں کے خاکے، اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فی البدیہہ تیار کیے گئے۔ مختلف اردو اور انگریزی کتابوں پر محمد یوسف صاحب نے مولانا کے جو دیباچے اور تقریظات جمع کی ہیں (۲:۱۳۷ تا ۷۵۶) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا موصوف لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی میں فیاض واقع ہوئے تھے مگر ان کی رائے بہت محتاط ہوتی تھی۔

یہ سب چیزیں مولانا کی منظم اور منضبط شخصیت کا پتا دیتی ہیں۔

تذکرہ کی زیر نظر دونوں جلدیں، مولانا مودودیؒ، میاں طفیل محمد اور جماعت کے بہت سے مرحومین (بالخصوص مولانا امین احسن اصلاحی) دینی جماعتوں، سیاسی گروہوں، پاکستان میں دین اور لادینیت کی کش مکش، مسلم لیگ، جاہ طلب اور اقتدار پرست افراد اور گروہوں کے آمرانہ اقدامات اور محلاتی سازشوں، غرض برعظیم کی تقریباً ایک صدی کی دینی، تہذیبی، علمی اور سیاسی تاریخ کا ایک جامع مرقع اور خزینہ معلومات ہے۔ کہیں کہیں متن پر مفید اور معلومات افزا حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے۔ خیال ہوتا ہے کاش جمیل احمد رانا، حواشی کا اور زیادہ، اہتمام کرتے۔

مرتبین نے مواد و لوازمہ جمع کرنے میں جو مشقت اٹھائی، اس کا اندازہ، دونوں جلدوں کے بہ غور مطالعے کے بغیر نہیں ہو سکتا، اور مطالعہ کرتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ مولانا مودودیؒ نے ۱۹۴۱ میں جس جماعت کی بنیاد ڈالی تھی، اپنی ۶۰ سالہ زندگی میں اب وہ ایک ہمہ گیر اور موثر تحریک بن چکی ہے اور اس کے اثرات پوری دنیا میں پھیل چکے ہیں۔ تحریکوں میں وسعت اور پھیلاؤ کے نتیجے میں متعدد مسائل پیدا ہوتے ہیں اور کچھ کمی کوتاہی بھی فطری ہے۔ اب اس مرحلے پر تحریک اسلامی کو بیدار و ہشیار اور صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تیار و مستعد رہنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں مولانا مودودیؒ کی ہدایات اور اُن کے رفقا کے خیالات سے ہمیں خاصی رہنمائی ملتی ہے۔ ذیل میں ہم تذکرہ کے مطالعے سے اخذ کردہ، چند نکات پیش کر رہے ہیں:

○ اقامت دین یا اسلامی انقلاب دو چار یا دس بارہ سال کا کام نہیں بلکہ ایک صبر آزما طویل مجاہدہ ہے۔ بانی جماعتؒ نے ابتدا ہی میں واضح کر دیا تھا کہ میں کھجور کا درخت لگا رہا ہوں، یہ تیسری، چوتھی، پانچویں نسل میں جاکر، پھل دے گا۔ ظاہر ہے ہزار بارہ سو برس کا انحطاط، دس بیس برس میں تو دور نہیں ہو جائے گا۔ امرواقعہ یہ ہے کہ جب تک آپ لوگوں کے ذہن تبدیل (convert) نہ کریں اس وقت تک نہ صحیح معنوں میں کوئی انقلاب لایا جا سکتا ہے اور نہ وہ دیرپا ہو سکتا ہے (میاں طفیل محمد، ۳:۲۶۱، ۲۶۲)۔

○ اسلام کے فکری پہلوؤں پر، خصوصاً جدید نظریات اور معاصر فتنوں کے حوالے سے ٹھوس علمی و تحقیقی کام، خاطر خواہ توجہ چاہتا ہے۔ مولانا اس سلسلے میں بہت فکر مند تھے اور انھیں یہ اندیشہ تھا کہ "میرا یہ سلسلہ، میرے ساتھ ہی قبر میں چلا جائے گا" (شیخ محبوب علی، ۳: ۳۱۸)۔ شاید اس لیے کہ اس تحقیق و تصنیف کے لیے مردان کار بہت کم ہیں۔ جو گنے چنے لکھنے والے ہیں، مولانا مودودیؒ کو شکایت تھی کہ ان کا مطالعہ، خام اور ادھورا ہوتا ہے (مولانا محمد ناظم ندوی، ۳: ۳۴۹)۔ فکر مندی کی بات یہ ہے کہ ادارہ تحقیق و تصنیف علی گڑھ کے طرز پر، پاکستان میں کوئی تربیتی اور تصنیفی ادارہ قائم نہیں ہو سکا۔

○ میاں طفیل محمد صاحب کی یہ تجویز اہم ہے کہ حیات جاوید اور حیات شبلی کی طرح "حیات مودودیؒ" کی تالیف کا کام بھی ضرور ہونا چاہیے (یہ بات اطمینان بخش ہے کہ معروف مورخ اور محقق جناب آباد شاہ پوری ادارہ معارف اسلامی، لاہور کے تحت یہ کام کر رہے ہیں)۔ "یہ ہم پر گویا ایک قسم کا قرض ہے" (۳: ۴۳۵)۔ سوانح کے ساتھ ایک جامع "کتابیات مودودیؒ" کی تیاری بھی علمی ضرورت ہے۔ بہ حوالہ ۳: ۶۲۶، "تصانیف مودودیؒ" کے اشاعتی اور کتابیاتی مطالعے کو مزید آگے بڑھانا چاہیے۔ اس ضمن میں جناب نعیم صدیقی کے نکات بھی قابل غور ہیں جن پر کام کے لیے "ایثار پیشہ عزیمت مندوں" کی ضرورت ہے (۳: ۴۶۲)۔ راقم کا خیال ہے کہ کوئی صاحب خیر اور صاحب احساس، "مودودیؒ اکیڈمی" کا ڈول ڈال سکیں تو اس نوع کے مزید منصوبے بھی تیار اور تکمیل پذیر ہو سکیں گے۔

○ مولانا مودودیؒ نے شخصیت پرستی کی حوصلہ شکنی کی اور تحریک اسلامی کا مجموعی مزاج بھی یہی رہا ہے، مگر شخصیات کی یاد تازہ رہے تو یہ چیز مزید کاموں کے لیے ایک محرک بھی بنتی ہے۔ ایک عرصے سے راقم کے ذہن میں ایک تجویز ہے: کیوں نہ ایک حفاظت خانہ (آرکائیوز) قائم کیا جائے جس میں ریڈیو اور ٹی وی میں محفوظ مولانا کے بیانات اور مصاحبوں پر مشتمل آڈیو اور وڈیو، ۲۶، ۲۷ ستمبر ۱۹۷۹ کو ریڈیو پاکستان لاہور کے سفر آخرت کا رواں احوال (کمنٹری) اور اسی طرح کی مزید سمعی و بصری یادداشتیں محفوظ کر لی جائیں (ڈاکٹر ابن فرید، ۳: ۵۹۷)۔ زیر نظر دونوں جلدوں کے آخر میں بعض قدیم انتخابی پوسٹروں کے عکس چھاپے گئے ہیں۔ "دارالاسلام" پٹھان کوٹ کی عمارات کے باقیات کی چند تصاویر بھی شامل ہیں۔ مزید برآں مولانا کے بعض دست نوشت صفحات، چودھری رحمت علی کا ایک مکتوب بنام شیخ محمد نصیب بیرسٹر اور مولانا امین احسن اصلاحی کا خط بنام مولانا مودودیؒ بھی دیے گئے ہیں۔ اس نوع کی سیکڑوں تصاویر، مسودات، دستاویزات اور نادر چیزیں ادھر ادھر بکھری ہوئی ہیں۔ قیمتی ورثے کی حیثیت رکھنے والی اس نوع کی بہت سی چیزوں کو مجوزہ بالا آرکائیوز میں جمع کر دینا بڑا کام ہو گا۔

○ جمعیت کے افراد کے بارے میں مولانا فرماتے تھے کہ اپنے جس فیلڈ (میدان کار) میں بھی وہ پڑھ رہے ہیں یا پڑھا رہے ہیں تو اس میں مہارت اور امامت کا درجہ حاصل کریں، نیز اپنا کیریکٹر اسلام کی بنیاد

کے مطابق ڈھالنے اور بنانے کی کوشش کریں۔ مولانا کو کوئی موقع بھی طلبہ سے گفتگو و خطاب کا ملتا تو انھی چیزوں پر خاص طور پر زور دیتے تھے کیوں کہ مقابلہ مغربی افکار، مغرب سے علمی مرعوبیت اور مغربی تہذیب کے نفوذ کا تھا۔ اس لیے ان کا کہنا تھا کہ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں ان سے بڑھ کر تیاری کرنی چاہیے (شیخ محبوب علی، ۲: ۴۰۶)۔

○ مولانا مرحوم چاہتے تھے کہ جمیعت سے فارغ ہونے والے نوجوانوں کا عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد بھی اپنے احباب سے رابطہ برقرار رہے، وہ جہاں بھی جائیں، ان کا کمٹ منٹ باقی رہے (شیخ محبوب علی، ۲: ۴۱۲)۔

زیر نظر تذکرہ، مولانا مودودیؒ کی نابغہ عصر شخصیت کی جو جھلک دکھاتا ہے بلاشبہ اس سے مولانا سے ہماری محبت بڑھتی ہے اور ان کی عظمت کا احساس بھی فزوں ہوتا ہے، مگر خود مولانا شخصیت پرستی کے قائل نہ تھے اس لیے ان کا اصل اور اہم حوالہ ان کی فکر اور ان کا علمی و تصنیفی کارنامہ ہے۔ یہ فکر اور کارنامہ کیا ہے؟ جناب خرم مرادؒ نے اپنے قابل قدر مضمون "قرآنی پیغام کی ترجمانی، سید مودودیؒ کی زبانی" میں عمدگی کے ساتھ فکر مودودیؒ کی وضاحت کی ہے۔ ان کے خیال میں: "ان کی فکر کوئی نئی فکر نہ تھی، عین ترجمان قرآن تھی۔ اس لیے انھوں نے انتہائی شدت کے ساتھ اس بات کا اہتمام کیا کہ ان کے افکار و آرا پر "فکر مودودیؒ" کی چھاپ نہ لگے۔ ان کے گرد فکر مودودیؒ کے نام سے کوئی مسلک نہ بننے پائے" (۳: ۲۸۵)--- اور یہ کہ: "ان کی سب سے بڑی خدمت، اسلامی فکر کا احیا ہے" (۳: ۲۵۹)۔ آخر میں خرم صاحب (مرحوم) نے بجا طور پر کہا ہے:

> آج ان کی فکر کے صحیح وارث وہی ہو سکتے ہیں، جو ان کی فکری خدمات کی روشنی میں، اجتہاد و فکر سے کام لیں، ماضی کے اسیر نہ ہوں، حال کے مناسب طریقے اختیار کریں اور مستقبل کے نقیب بنیں، ٹھیک جس طرح انھوں نے اپنے زمانے میں کیا (۳: ۲۷۴)۔

یہی فکر مودودیؒ کا حاصل اور یہی مولانا کا پیغام ہے۔ تذکرہ سید مودودی اس فکر اور اس پیغام کو نمایاں اور اجاگر کرنے کی ایک اچھی کوشش ہے، ایک بامعنی اور کامیاب علمی کاوش جس پر مرتبین مبارک باد کے مستحق ہیں اور ادارہ معارف اسلامی اس کی اشاعت پر داد و تحسین کا سزاوار ہے۔ امید ہے ادارہ اسی نوعیت کے مزید علمی منصوبوں کو بروئے کار لانے کا اہتمام کرتا رہے گا۔

مولانا سعد الدینؒ کی یاد میں

پروفیسر خورشید احمد

مولانا سعد الدینؒ ریاست جموں و کشمیر میں تحریک اسلامی کے داعی اور امیر کی حیثیت سے ایک انقلاب آفریں شخصیت تھے جن کے فکر اور کردار نے کئی نسلوں کی زندگیاں تبدیل کر دیں۔ مجھے یقین ہے جس طرح ان کے جنازے میں کشمیر کے ہزاروں متوالوں نے شرکت کی اسی طرح ملاے اعلیٰ میں اللہ کے فرشتوں نے ان کا استقبال کیا ہو گا اور جنت کی فضاؤں نے انھیں خوش آمدید کہا ہو گا۔

مولانا سعد الدینؒ کے نام نامی اور ان کی گراں قدر دعوتی، علمی، تعلیمی اور تحریکی خدمات سے تو میں اپنے طالب علمی کے دور ہی میں واقف ہو گیا تھا۔ جب ریاست جموں و کشمیر کا ذکر تحریکی حلقوں میں ہوتا تو بات ان کے نام گرامی پر مرکوز ہو جاتی۔ اپنے ایام اسیری میں جو لمحات اپنے اور آپ کے مرشد سید مودودی کے ساتھ گزارے، اس زمانے میں خود مولانا کی زبان سے مولانا سعد الدینؒ کا تذکرہ سنا۔ لیکن ان سے ملنے کی سعادت ۱۹۸۰ میں حاصل ہوئی۔ دو ملاقاتیں پاکستان میں اور ایک سعودی عرب میں، میری یادوں کا حسین سرمایہ ہیں۔

ان کی صحبت میں انسان ایک غیر معمولی کیفیت میں اپنے آپ کو محسوس کرتا تھا۔ یہ تجربہ زندگی میں کم ہی ہوا ہے۔ ہر بار ان سے مل کر احساس ہوا کہ ایک ایسے شخص کی رفاقت حاصل ہے جو فنا فی اللہ ہے، جس کے پرنور چہرے اور جس کے پرتاثیر کلمات سے للہیت کی روشنی اور خوشبو ضوفشاں ہے، جس سے ان سے ملنے والا متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔ ان تینوں نشستوں میں یہ تاثر گہرا ہی ہوتا گیا۔ ان کی بردباری، محبت اور شفقت، معاملہ فہمی، تدبر، حکمت و دانائی اور اسلام اور مسلمانوں سے والہانہ شغف کے گہرے نقوش قلب و نظر پر مرتسم ہوئے۔ لیکن سب سے بڑھ کر نقش ان کی للہیت ہی کا رہا۔ دل نے گواہی دی کہ الحمدللہ ہر دور میں اور ہر علاقے میں رسول عربیؐ کی امت میں سچے اللہ والے جو اسلاف کا نمونہ ہیں، موجود ہیں اور یہ روشن چراغ اسی طرح تابناک رہیں گے۔ ان شاء اللہ!

میں اپنے تاثرات کا جائزہ لیتا ہوں تو سب سے پہلے مولانا سعد الدینؒ کی شخصیت سامنے آتی ہے۔ ان کا علم، ان کی خدمات، ان کے اثرات سب مسلم، لیکن میرے دل پر سب سے گہرا اثر ان کی پرسوز شخصیت کا ہے جس میں بلا کی مقناطیسی کشش تھی۔ پہلی نظر میں دل ان کا گرویدہ ہو گیا، پھر ان کی باتوں سے حکمت و دانائی معلوم ہوئی اور حقیقت زندگی کے ورق الٹتے رہے اور یہ احساس گہرا اور گہرا تر ہوتا گیا کہ یہ سادہ پوش بزرگ صفت انسان حالات پر گہری نظر رکھتا ہے اور تحریک کے معاملات کو ژرف نگاہی سے دیکھتا اور گتھیوں کو سلجھاتا ہے۔

مولانا سعد الدینؒ ۱۹۳۸ء میں ترجمان القرآن کے ذریعے مولانا مودودیؒ کی دعوت سے روشناس ہوئے اور اپنے قصبے و قرب میں ان کی آواز کی بازگشت محسوس ہونے لگی جو بہ طلاپ وادی کشمیر میں تحریک اسلامی کے پودے کی کاشت کا ذریعہ بنی۔ ۱۹۴۲ء میں شوپیاں میں چند دوسرے ایسے ہی حق کے طالبوں نے جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی اور مولانا سعد الدینؒ کو امیر منتخب کیا۔ یہ ذمہ داری انھوں نے نرم و گرم اور سخت سست ہر قسم کے حالات میں ۱۹۸۵ء تک انجام دی۔ جب وہ امارت سے فارغ ہوئے تو وہی ننھا پودا جو ان پاک نفوس نے صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے لگایا تھا، ایک حسین باغ اور ہری بھری فصل بن چکا تھا جس نے وادی ہی نہیں جموں و کشمیر کے طول و عرض میں دعوت اسلامی، اسلامی تعلیم و تربیت اور خدمت و تعاون کی ایک فصل کھڑی کر دی جو بھارت کے ظلم و جبر اور خود ریاست کے مفاد پرست اور مصلحت کوش عناصر کے تشدد اور تعذیب کے باوجود طوفان باد و باراں کا مقابلہ کر رہی تھی اور مستقبل کی روشنی اور تابناکی کی خبر اس طرح دے رہی تھی:

كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ (الفتح ۴۸:۲۹)

گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل نکالی، پھر اس کو تقویت دی، پھر وہ گدرائی، پھر اپنے تنے پر کھڑی ہو گئی۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں۔

مولانا سعد الدینؒ کا اوڑھنا بچھونا قرآن پاک تھا۔ وہ قرآن کی تعلیم ہی کو امت کی ترقی کا اصل ذریعہ سمجھتے تھے۔ مردوں سے بھی زیادہ عورتوں کی تعلیم و ترقی کے داعی تھے۔ وہ تعلیم ہی کے ذریعے زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب برپا کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے آخری پارے کی تفسیر بھی لکھی جو ہزاروں اسکولوں اور مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ انھوں نے پوری ریاست میں ابتدائی اور ثانوی تعلیمی اداروں کا ایک جال بچھا دیا تاکہ نئی نسلوں کا رشتہ اسلام سے استوار رہے اور بھارت کے فکری، ثقافتی، تمدنی اور سیاسی استعمار کی گرفت سے ملت کو بچایا جا سکے۔ ان کی تصنیفات بنیادی اسلامی دعوت سے لے کر فقہ اور اسلامی معاشیات تک ہیں لیکن ان کی فکر کا اصل محور قرآن پاک اور دعوت کا اصل ہدف انسان کی تبدیلی، حق کی دعوت، دین کی شہادت اور اس کی اقامت ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ان کے پیغام اور ان کے ساتھیوں اور

جماعت اسلامی کی جدوجہد کو ایک انقلابی تحریک بنا دیا۔

وہ بہت سوچ سمجھ کر، ٹھہر ٹھہر کر بولتے تھے، دھیمے انداز میں لیکن بڑے محکم دلائل کے ساتھ اپنی بات پیش کرتے تھے اور سب سے بڑھ کر ان کو اس قائدانہ صلاحیت پر عبور حاصل تھا کہ کیا چیز کہنے کی ہے اور کیا کام صرف کرنے کا ہے۔ کب، کہاں اور کس سے کیا بات کہنی ہے۔ کہاں اظہار میں دعوت کے تقاضے پورے ہوتے ہیں اور کہاں سکوت، اظہار پر فوقیت رکھتا ہے۔ انھوں نے دعوت اسلامی کے ساتھ ملت کشمیر کی سیاسی رہنمائی بھی کی۔ بھارت کی بالادستی کو کبھی قبول نہ کیا، الحاق کو متنازع کہا اور برملا کہا اور اس کی سزا ایمان اور فخر کے ساتھ بھگتی۔ انھوں نے بیرونی استعمار سے آزادی کی روح، نئی نسلوں ہی میں نہیں، سفید ریش بزرگوں میں بھی پھونک دی، لیکن اس حکمت اور دانائی کے ساتھ کہ نہ دعوتی اور سیاسی کام کا توازن مجروح ہوا اور نہ تحریک اسلامی کے دستور، طریق کار اور مزاج میں کوئی انحراف واقع ہوا۔ یہ توازن، یہ اعتدال، یہ سوجھ بوجھ، یہ حکمت اپنی نظیر آپ ہے اور ہماری آج کی قیادتوں کے لیے اس میں بڑی روشنی اور رہنمائی ہے۔

اللہ تعالیٰ مولانا سعد الدینؒ کی خدمات کو شرف قبول بخشے، ان کی بشری لغزشوں سے صرف نظر فرمائے، انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے درجات بلند سے بلند تر فرمائے۔ آمین! جو قبولیت، عزت، اکرام، محبت اور عقیدت ان کو ان کی بے لوث خدمت کی وجہ سے خود دنیا میں حاصل ہوئی وہ اس امر پر گواہ ہے کہ وہ اللہ کے مقبول بندوں میں سے تھے۔ جس طرح ان کا چرچا ان کی موت کے بعد بھی جاری رہا اور ان کی جاری کردہ دعوت اور پیغام مسلسل کمیت اور کیفیت ہر اعتبار سے روز افزوں ہے، اس کی بنا پر تو دل سے بے ساختہ یہ آواز نکلتی ہے ؎

بجھا ہے دل، تو دل ہی دل کے چرچے ہیں
جو اس طرح سے موت آئے، تو کون مرتا ہے

(مولانا سعد الدینؒ کی یاد میں منعقد ہونے والے سیمی نار میں پڑھا گیا۔ اسلام آباد، ۱۸ اپریل ۹۹)

رسائل و مسائل

پیدائشی مسلمان اور جزا و سزا

سوال: میں ایک ہندو ہوں، میرے ان چند سوالوں کا تحقیقی جواب دیں تو بہت کرم ہو گا۔

۱۔ پیدائشی مسلمان ہونا کوئی خوبی نہیں ہے۔ نہ پیدائشی ہندو یا عیسائی ہونا کوئی عیب ہے۔ پھر آپ کے ملا مولوی یہ کیوں کہتے ہیں کہ مسلمان اچھے اور جنتی ہیں، کافر برے اور جہنمی ہیں۔ کیا جنت جہنم کا فیصلہ پیدائشی بنیادوں پر ہونا انصاف ہے؟

۲۔ میرا خیال ہے کہ کافر وہ ہے جو پیدائشی مسلمان ہے اور پھر نظریات اور اعمال سے ہٹ گیا۔ ہم بت پرست ہیں تو کیا ہوا، یہ تو ہمارا پیدائشی مذہب ہے۔ لیکن مسلمان اگر قبر پرست ہے یا گناہ کرتا ہے تو وہ بھی کافر ہے کیونکہ اس نے اختیاری کفر کیا۔

۳۔ آج مسلمان اخلاق و کردار کے لحاظ سے کفار سے بھی بدتر ہے حالانکہ وہ روشنی رکھتا ہے۔ روشنی کے باوجود کوئی ٹھوکر کھا کر گرے تو وہ قصوروار ہے یا وہ جو اندھیرے میں گر پڑے؟ اللہ کے ہاں کون زیادہ سزا کا حق دار ہے؟

۴۔ اسلام توحید کا دین ہے مگر اب توحید کہاں! ہم اپنے اوتار پوجتے ہیں، تم اپنی شخصیات پوجتے ہو۔ فرق کیا ہوا؟ ہم تو پیدائشی ایسے ہیں لیکن تم لوگ خود توحید سے پھر گئے۔ کس کا قصور ہوا؟ انصاف تو یہ ہے کہ کفر و شرک کا اصل مقدمہ تم پر چلے۔ ہمارا قصور بس اتنا ہے کہ ہم پیدائشی توحید سے 'محروم کیے گئے' اور یہ کوئی جرم نہیں۔ ہمیں صحیح فکر و عمل کی کس نے تعلیم دی؟ کس نے ہمیں متاثر کیا کہ ہم بدل جائیں؟

۵۔ عقل کا تقاضا ہے کہ پیدائشی ایمان و کفر کا کوئی وزن نہ ہو۔ اختیاری ایمان اور کفر ضرور قابل مواخذہ ہیں۔ مسلمانوں میں اختیاری کفر ہے۔ ازروے انصاف یہی دوزخی ہیں۔ خدا نسلی اور رسمی کلمے کی بنیاد پر جنت دوزخ کا فیصلہ نہیں کرے گا۔

۶۔ قبر اور تعصب پرست بھی مسلمان، سیکولر اور اسلام کے مخالف بھی مسلمان، قاتل و غاصب، اغوا کرنے والے، فسادی، زانی، شرابی وغیرہ سب مسلمان اور جنتی۔ کیونکہ انھوں نے

کلمہ پڑھا۔ سوچیں کہ انھوں نے کب کلمہ پڑھا' کلمہ تو ان کو پیدائش ملا۔ اب وہ اس کو رسمی پڑھتے ہیں لیکن فکر اور عمل میں ہم جیسے ہیں۔ کیا اس رسمی ادائیگی پر اللہ جنت جنہم کا فیصلہ کرے گا؟

جواب : آپ کے خط سے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ ہندو مذہب کے پیروکار ہونے کے باوجود آپ ترجمان القرآن کا مطالعہ کرتے ہیں۔ آپ کی یہ جستجو اور تلاش حق لائق تحسین ہے۔ اس بات سے بھی خوشی ہوئی کہ آپ نے کفار کے جہنمی کہلائے جانے کے بارے میں اپنے احساسات کا اظہار بلاتکلف اپنے خط میں کیا ہے اور کھلے ذہن کے ساتھ جو سوالات اٹھائے ہیں ان کے علمی جواب چاہتے ہیں۔

پہلی بات یہ سمجھ لیجیے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ہر بچہ اسلام کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ گویا کوئی بچہ ہندو یا عیسائی پیدا نہیں ہوتا بلکہ ہر بچہ اللہ تعالٰی کے مقرر کردہ نظام بندگی و اطاعت کی پیروی کرتے ہوئے مسلمان پیدا ہوتا ہے۔ بہت سے انسان جو اپنے آپ کو ہندو یا عیسائی کہتے ہیں' درحقیقت پیدائش کے وقت اپنی فطرت کے لحاظ سے مسلمان ہی پیدا ہوتے ہیں اور بعد میں اپنے ماحول اور والدین کے زیر اثر عیسائی یا ہندو بن جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ مسلمان گھرانے میں جو بچہ بھی پیدا ہوتا ہے پیدائش کے فوراً بعد اس کے کانوں میں ندائے اذان کے ذریعے اسلام کی دعوت علاماتی طور پر پہنچادی جاتی ہے۔

یہی بچہ جب بڑا ہوتا ہے تو اسے شعوری طور پر اسلامی تعلیمات سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ اسے قرآن کریم کے مطالعے' حفظ اور سیرت پاک سے متعارف کرایا جاتا ہے اور اب وہ اسلام کی تعلیمات کو سمجھ کر اپنے مسلمان ہونے کا ادراک کرتا ہے۔ آپ کی یہ بات درست ہے کہ عموماً ایک بچے کے ماں اور باپ دونوں مسلمان ہوں تو پاسپورٹ کے خانہ اندراج میں یا اسکول کے داخلہ فارم میں اس کا دین اسلام ہی لکھا جاتا ہے۔ اب اگر وہ رسمی طور پر مسلمان ہونے کے باوجود قرآن کریم کی تعلیمات اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو ایک ایک کر کے رد کرتا ہے تو وہ عملاً کفر کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس بات کو قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر فرمایا گیا ہے کہ ایمان لانے کے بعد کافر نہ ہو جاؤ' یا ناشکرے نہ بن جاؤ----- اور جب تمھارے پروردگار نے تم کو آگاہ کیا کہ اگر شکر کرو گے تو میں تمھیں زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری (کفر) کرو گے تو یاد رکھو میرا عذاب بھی سخت ہے (ابراھیم ۱۴:۷)۔ اسی طرح سورہ النحل میں فرمایا گیا اور اللہ ایک بستی کی مثال بیان فرماتا ہے کہ امن و چین کی بستی تھی ہر طرف سے رزق بافراغت چلا آتا تھا مگر ان لوگوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری (فکفرت) کی تو اللہ نے ان کے اعمال کے سبب ان کو بھوک اور خوف کے لباس پہنا کر (ناشکری کا) مزہ چکھا دیا (النحل ۱۶:۱۱۲)۔

کفر دراصل اللہ تعالیٰ کے خالق' رب' مالک' حاکم اور ہادی ہونے سے انکار کرنے کا نام ہے۔ اس کا ارتکاب ایک ایسا شخص بھی کر سکتا ہے جو زبان سے تو یہ کہتا ہو کہ سورج' چاند' پہاڑ' دریا' سرسبز و شاداب کھیتیاں' پھلوں سے لدے درخت' پانی سے بھرے ہوئے بادل اس نے نہیں بلکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ہی بنائے ہیں۔ وہی اسے ایک غیر محسوس وجود سے بڑا کرتا ہے' گوشت پوست کے لوتھڑے میں تبدیل کرتا ہے' پھر اسے متوازن شکل و صورت دیتا ہے' خوب صورت و حسین و جمیل بناتا ہے' جان ڈالتا ہے اور پیدائش کے بعد جب وہ اس قابل بھی نہیں ہوتا کہ اپنے منہ میں پانی یا دودھ کے دو قطرے اپنے ہاتھ سے ڈال سکے' محبت کرنے والی ماں اور باپ کے سہارے بڑا کرتا ہے۔ پھر اسے بچپن سے جوانی' ادھیڑ عمر اور بڑھاپے تک سفر کراتا ہے۔ یہ سب کچھ درست لیکن جب وہ ہوش سنبھال کر ایک پڑھا لکھا یا غیر پڑھا لکھا شخص بن جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی ہر ہدایت کو نظرانداز کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے کہتا ہے کہ پاک اور صاف اشیا جتنی چاہو کھاؤ تاکہ تم صحت مند اور تندرست رہو' وہ ہر نجس چیز پر شوق سے ٹوٹتا ہے۔ اللہ کہتا ہے کہ ماں باپ کا احترام و اطاعت کرو' وہ ان کی ہر مرضی کے خلاف کرتا ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ میرے بندوں کے ساتھ انصاف و عدل کرو' ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرو' وہ اللہ کے بندوں کے حقوق غصب کرتا ہے۔ گویا زبان سے یہ کہنے کے باوجود کہ اے رب! اے مالک! تو ہی میرا خالق ہے' اللہ کے ہر حکم کی خلاف ورزی کرنا' یہی کفر ہے۔ یہ ناشکری ہے' اس لیے کہ شکر کا مطلب اللہ تعالیٰ کو حاکم و مالک مانتے ہوئے صرف اور صرف اس کی بندگی و اطاعت ہے۔

عقل' مشاہدہ اور تجزیے کے ذریعے اس حقیقت تک پہنچنے کا نام کہ کائنات اور انسان کا خالق' مالک صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہے اور صرف اسی کی بندگی و اطاعت کی جائے' اسلام ہے۔

اگر مشاہدہ' عقل اور تجزیہ اس بات کی گواہی دے کہ اصل مالک اور حاکم تو اللہ ہی ہے لیکن انسان اپنے عمل کے ذریعے جو کچھ' جہاں اور جب چاہے کرتا رہے تو اس کا نام کفر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے اقرار کے باوجود خود کو اس کی بندگی سے نکال کر اپنی عقل' پسند' نفس اور خواہش کو خدا بنا لینا۔

کفر کی بدترین شکل شرک ہے' جس میں نہ صرف اللہ تعالیٰ کی وحدانیت یعنی اعلیٰ ترین حاکم ہونے کا انکار و تردید کی جاتی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو شریک کر لیا جاتا ہے۔ اس کی بہت سی شکلیں ہیں۔ ایک شکل یہ ہے کہ اس کے علاوہ دوسروں کو بھی رازق مانا جائے ---- بھلا اگر وہ اپنا رزق بند کر لے تو کون ہے جو تم کو رزق دے لیکن یہ سرکشی اور نفرت میں پھنسے ہوئے ہیں (الملک ۶۷: ۲۱)۔ بعض صورتوں میں اللہ کو خالق تو مانا جاتا ہے لیکن نفع اور نقصان کے پہنچنے میں دوسروں کو شریک کر لیا جاتا ہے---- اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو کہہ دیں گے کہ اللہ نے۔ کہو

بھلا دیکھو تو جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو اگر اللہ مجھ کو کوئی تکلیف پہنچانی چاہے تو کیا وہ اس تکلیف کو دور کر سکتے ہیں۔ کہہ دو کہ مجھے اللہ ہی کافی ہے۔ بھروسا رکھنے والے اسی پر بھروسا رکھتے ہیں (الزمر ۳۹: ۳۸)۔ یہی مضمون سورہ الرعد میں آیت نمبر ۱۶ میں یوں بیان فرمایا ہے: آپ کہیے کہ آسمانوں زمین کا پروردگار کون ہے۔ آپ کہہ دیجیے وہ اللہ ہے---- آپ یہ کہیے کہ کیا پھر بھی تم نے اللہ کے سوا دوسرے مددگار قرار دے رکھے ہیں جو خود اپنی ذات کے نفع و نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتے۔ آپ کہیے کہ کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتا ہے یا کہیں تاریکی اور روشنی برابر ہو سکتی ہے۔ کیا انھوں نے اللہ کے ایسے شریک قرار دے رکھے ہیں کہ انھوں نے بھی پیدا کیا ہو جیسا اللہ پیدا کرتا ہے۔ پھر ان کو پیدا کرنا ایک سا معلوم ہوا ہو آپ کہہ دیجیے اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہی واحد ہے غالب ---- کہیں یوں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ایک کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے برابر کسی چیز کا مالک نہیں ہے (فاطر ۳۵: ۱۳)۔

مشرکین کے اس خیال کی تردید بھی قرآن کریم نے بہت واضح طور پر فرمائی ہے کہ ان کا شرک اور مذہب ان پر مسلط کر دیا جاتا ہے' یا انھیں مجبوراً مشرک گھرانے میں پیدا کر دیا جاتا ہے--- اور کہتے ہیں اگر رحمٰن چاہتا تو ہم ان کو نہ پوجتے۔ ان کو اس کا کچھ علم نہیں۔ یہ تو صرف ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں (الزخرف ۴۳: ۲۰)۔ بعض اوقات مشرکین کا کہنا ہوتا ہے کہ ہم نے بچپن سے اپنے باپ دادا کو شرک کرتے ہوئے دیکھا اس لیے ہم بھی مشرک بن گئے۔ چونکہ باپ دادا عیسائی یا ہندو تھے اس لیے ہم بھی ان کی طرح اس مذہب کے پیروکار بن گئے---- اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جو کتاب اللہ نے نازل فرمائی ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں نہیں بلکہ ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ بھلا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ سیدھے رستے پر ہوں تب بھی وہ انھی کی تقلید کیے جائیں گے (البقرہ ۲: ۱۷۰)۔ یہی مضمون المائدہ ۵: ۱۰۴' الانعام ۶: ۱۴۹' الاعراف ۷: ۱۷۳' لقمن ۳۱: ۲۱ اور الصف ۷۹:۴۳ میں وضاحت سے بیان ہوا ہے۔

گویا عقلی طور پر یہ کہنا بے معنی ہے کہ چونکہ ہمارے باپ دادا پڑھے لکھے نہ تھے' ہم بھی جاہل رہیں' چونکہ وہ آنکھیں بند کر کے کار چلاتے تھے ہم بھی ویسا ہی کریں اور ہر چوراہے پر حادثہ کرنے اور زخمی ہونے کے باوجود ان کی اندھی پیروی پر اصرار کرتے رہیں۔

اس آباپرستی کو قرآن کریم نے شرک کہا ہے اور ہمیں اس سے بچنے کی تاکید کی ہے۔ شرک کی شکلوں میں ظن و گمان کی پیروی کو بھی شامل کیا گیا ہے یعنی غیر یقینی علم کی بنا پر کسی کام کو کرنا بھی شرک قرار دیا گیا ہے۔ یاد رکھو کہ جتنے کچھ آسمانوں میں ہیں اور جتنے زمین میں ہیں سب اللہ ہی کے ہیں اور جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر دوسرے شرکا کی عبادت کرتے ہیں' کس چیز کا اتباع کر رہے ہیں۔ محض بے بنیاد خیال (ظن) کا

اتباع کر رہے ہیں اور محض قیاسی باتیں کر رہے ہیں (یونس ۱۰:۶۶)---- قرآن کریم کی روشنی میں ایک شخص، مسلمان ہو یا غیر مسلم، اگر وہ اللہ تعالیٰ کو خالق و مالک ماننے کے باوجود مدد اور نصرت کے لیے دوسروں کو پکارتا ہے تو وہ شرک کا ارتکاب کرتا ہے۔ اور جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ نہ تمھاری ہی مدد کی طاقت رکھتے ہیں اور نہ خود اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں (الاعراف ۷:۱۹۷)---- شرک ایک ایسا ذہن پیدا کر دیتا ہے جو زبان سے یہی کہتا ہے کہ سب سے اعلیٰ رب ایک ہی ہے یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ، لیکن زندگی کے معاملات میں اللہ کو چھوڑ کر کبھی مال و دولت کو، کبھی ذات برادری کو، کبھی رسوم و رواج کو اور کبھی صاحب اختیار افراد کو وہ مقام دے دیا جاتا ہے جو صرف قادر مطلق کا ہے جو جلاتا اور مارتا ہے، عزت و ذلت دیتا ہے اور نفع و نقصان کا مالک ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے: کیا انھوں نے اس کے سوا کارساز بنائے ہیں؟ کارساز تو اللہ ہی ہے اور وہی مردوں کو زندہ کرے گا اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (الشوریٰ ۴۲:۹)---- جن افراد کو مشرکین اللہ کا مددگار سمجھتے ہیں خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ، انسان ہوں یا مٹی اور لکڑی کے تراشے ہوئے بے جان مجسمے، وہ قرآن کی نگاہ میں اتنے بے بس اور بے اختیار ہیں کہ خود اپنا دفاع نہیں کر سکتے، وہ کسی دوسرے کو کیا فائدہ یا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ آپ فرما دیجیے کہ جن کو تم اللہ کے سوا قرار دے رہے ہو، ذرا ان کو پکارو تو سہی وہ نہ تم سے تکلیف کو دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ اس کے بدل ڈالنے کا۔ یہ لوگ جن کو (اللہ کے سوا) پکارتے ہیں وہ خود اپنے پروردگار کے ہاں ذریعہ (وسیلہ) تلاش کرتے رہتے ہیں کہ کون ان میں زیادہ مقرب ہے اور اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے خوف رکھتے ہیں۔ بے شک تمھارے پروردگار کا عذاب ڈرنے والی چیز ہے (بنی اسرائیل ۱۷:۵۶-۵۷)۔

چونکہ شرک کی بنیاد ظن و گمان ہے، یقین و ایمان نہیں، اس لیے محض اپنی سوچ اور فکر سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں غلط تصورات قائم کر لینا گویا اللہ تعالیٰ پر بہتان لگانے کے مترادف ہے۔ اللہ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا اور گناہ کو جس کو چاہے معاف کر دے۔ اور جس نے اللہ کا شریک مقرر کیا اس نے بڑا بہتان باندھا (النساء ۴:۴۸)---- اسی بنا پر شرک کو ظلم عظیم قرار دیا گیا ہے (لقمن ۳۱:۱۳) اور کہیں اسے کھلی گمراہی اور ضلالت کہا گیا ہے (النساء ۴:۱۱۶)۔

قرآن کریم کے ان واضح ارشادات کی روشنی میں آپ کے اٹھائے ہوئے سوالات کے جوابات یہ ہیں:

۱۔ ہر بچہ اسلام کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ اسلام اللہ تعالیٰ کی شعوری اور بالارادہ بندگی کا نام ہے۔

۲۔ جنت اور جہنم کا تعلق انسان کی سعی و عمل سے ہے۔ اس کا تعلق کسی کے نسب، ولدیت اور ذات برادری سے نہیں ہے کہ اعلیٰ ذات کے افراد خود بخود جنت میں پہنچ جائیں۔ اسلام کا اصول یہ ہے کہ

جو بھی نیک عمل کرے گا وہ جنت کا مستحق ہو گا۔ اس کا فیصلہ پیدائشی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ اگر ابوجہل' جو شرک کے مرض میں مبتلا تھا' مسلمان ہو جاتا تو جنت کا مستحق بن سکتا تھا۔

۳۔ بلاشبہ ایک شخص مسلمان ہونے کے بعد اگر قبر پرستی' بت پرستی' یا نفس پرستی کا مرتکب ہوتا ہے تو اپنے عہد کی خلاف ورزی کرتا ہے اور جب تک اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کر کے عمل صالح کو اختیار نہیں کرے گا اپنے آپ کو عذاب سے نہیں بچا سکتا۔ یہ بات قرآن کریم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح ارشادات میں کہی گئی ہے۔

۴۔ آپ کا کہنا درست ہے کہ آج بہت سے مسلمان دین اسلام کی تعلیمات سے لاعلمی' لاپروائی یا جان بوجھ کر اختیار نہ کرنے کے سبب مسلمانیت کے اعلیٰ مقام سے گر کر نفس' اقتدار اور ہوس کے بندے بن گئے ہیں۔ لیکن ایسے مسلمان بھی ہیں جو اللہ واحد کی بندگی و اطاعت کرتے ہوئے جام شہادت نوش کر لیتے ہیں۔ ان کا سر اللہ کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکتا۔

۵۔ جزا و سزا کا فیصلہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اپنے شاکر بندوں کو کتنا اعلیٰ اجر دے گا اور ناشکرے' کافر اور مشرک بندوں کو کس درجے کا عذاب دے گا' یہ صرف اس کے کرنے کا فیصلہ ہے۔ اس کے بارے میں کوئی انسان کوئی رائے نہیں دے سکتا۔

۶۔ بلاشبہ اسلام توحید خالص کا نام ہے اور آج لاکھوں کروڑوں مسلمان جو ہر سال حج پر جاتے ہیں اسی توحید خالص کا عملی اظہار حج میں کرتے ہیں' رمضان میں روزے رکھ کر کرتے ہیں اور عام حالات میں اپنے معاملات کو اللہ کی مرضی کے مطابق انجام دے کر اس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ہاں بعض گمراہ افراد اگر کسی شخصیت کے آگے سر جھکاتے ہیں تو یہ ان کی غلطی ہے۔ اسلام میں نہ کسی اوتار کا تصور ہے' نہ کسی مقدس شخصیت کا۔ انبیاے کرام' اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے بہترین اور بزرگ ترین افراد ہیں لیکن ان میں سے کسی کو بھی ہندو اوتاروں کی طرح کبھی پوجا نہیں جاتا۔

۷۔ پیدائشی طور پر ہندو ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ سچائی' حق اور ہدایت کو پا لینے کے بعد بھی ایک شخص گمراہی میں مبتلا رہے۔ اگر ایک شخص پیدائشی طور پر خون میں سرخ ذروں کی کمی کی بنا پر کمزور ہو تو کیا اسے تمام عمر اپنی کمزوری پر فخر کرنا چاہیے' یا کسی اچھے ڈاکٹر کے مشورے سے خون پیدا کرنے والی دوا اور غذا کے ذریعے قوی اور جسیم بن جانا چاہیے۔

۸۔ آپ کا خیال درست ہے کہ جتنی ذمہ داری آپ کی اپنی ہے کہ عقل و شعور کے ذریعے حق کو تلاش کریں اتنی ہی ذمہ داری مسلمانوں کی ہے کہ وہ ہندوؤں' قادیانیوں' عیسائیوں' بہائیوں وغیرہ تک اسلام کی تعلیمات لے جائیں' انھیں اپنے طرز عمل سے اسلام سے متعارف کرائیں اور ان تک پیغام حق

کو پہنچائیں۔

۹۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ وہ سب سے زیادہ عدل کرنے والے ہیں، وہ کبھی ظلم نہیں کر سکتے۔ چنانچہ قرآن کریم کا فرمان ہے: وہ ایک ذرہ برابر نیکی اور بدی کو بھی ضائع نہیں فرمائیں گے----- اس لیے اللہ کے ہاں فیصلے کی بنا رسمی اسلام نہیں، عملی اسلام ہے، یعنی کس نے اسلام پر کتنا عمل کیا۔ اسلام قاتل، غاصب، فسادی، زانی اور شرابی کو ایک لمحے کے لیے بھی جنت کا مستحق قرار نہیں دیتا، وہ صرف نیک عمل کو کامیابی کی شرط قرار دیتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب (ڈاکٹر انیس احمد)۔

کتاب نما

تاریخ نفاذ حدود، ڈاکٹر نور احمد شاہتاز۔ ناشر: فضلی سنز، اردو بازار، کراچی۔ صفحات: ۴۴۰۔ قیمت: ۳۰۰ روپے۔

وطن عزیز میں نفاذ شریعت کی تاریخ اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جتنی خود ملک کی اپنی تاریخ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کی تاسیس کی واحد بنیاد اور جواز ایک ایسے خطے کا حصول تھی جہاں اسلام کے احکام و تصورات کی بنیاد پر ایک جدید اسلامی معاشرہ اور جدید اسلامی ریاست قائم کی جاسکے۔ یوں تو نظری اور علمی اعتبار سے اس کام کا آغاز تاسیس پاکستان سے پہلے ہی ہو چکا تھا اور آل انڈیا مسلم لیگ نے ماہرین شریعت کی ایک کمیٹی ۴۰-۱۹۳۹ ہی سے قائم کر دی تھی جس کے ذمے نئی مملکت کا سیاسی اور آئینی نظام نامہ، معاشی اور مالیاتی خاکہ اور تعلیم و ثقافت کی ضرورتوں کی تحدید و تعیین کا اہم کام تھا۔ اگرچہ علمی تیاری کا یہ کام کسی نہ کسی حد تک، تشکیل پاکستان کے بعد بھی جاری رہا لیکن اس میں وہ تسلسل اور سنجیدگی محسوس نہیں ہوتی جس کا یہ عظیم الشان کام تقاضا کرتا تھا۔

۱۹۴۸، ۱۹۴۹، ۱۹۶۰، ۱۹۶۱، ۱۹۷۹، ۱۹۸۰، ۱۹۸۱، ۱۹۹۱ اور ۱۹۹۸ وہ سال ہیں جن میں وطن عزیز میں مختلف اسلامی قوانین نافذ ہوئے یا اہم آئینی فیصلے کیے گئے۔ ان میں سب سے اہم پیش رفت ۱۹۷۹ میں نافذ ہونے والے وہ قوانین تھے جن کو "قوانین حدود" سے یاد کیا جاتا ہے۔ یوں پاکستان، دور جدید میں سعودی عرب اور یمن کے بعد تیسرا ملک تھا جہاں حدود کے قوانین نافذ کیے گئے۔ گذشتہ ۲۰ سالوں میں ان قوانین کے نفاذ، طریقۂ کار اور نتائج کے بارے میں خاصا کام ہوا ہے اور انگریزی میں کئی کتابیں سامنے آئی ہیں جن میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں اہل علم نے اظہار خیال کیا ہے۔

زیر نظر کتاب اس اعتبار سے دلچسپ اور مفید ہے کہ اس میں مصنف نے اسلام کے تصور جرم و سزا کی شرح و وضاحت کے ساتھ، اس کا دوسرے مذاہب میں تصورات جرم و سزا سے تقابل بھی کیا ہے۔ کتاب کی خاصی طویل تمہید میں جو ۱۰۹ صفحات پر مشتمل ہے انھی مباحث کو شامل کیا گیا ہے۔ باب اول میں تاریخ اسلام اور جدید دنیاے اسلام میں حدود کے نفاذ کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ باب دوم، پاکستان میں نفاذ حدود کے جائزے پر مشتمل ہے۔ حدود کے جائزے کے پہلو بہ پہلو، ملک میں اہم دستوری ترامیم اور نفاذ شریعت کی عمومی کارکردگی پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر نور احمد شاہتاز مبارک باد اور شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اردو زبان میں ایک اہم خلا کو پر کیا اور قارئین کے لیے علمی، فکری اور فقہی دلچسپی کی ایک ایسی اہم کتاب تیار کی جو بہ یک وقت قانون اور تاریخ پاکستان کے طلبہ کے لیے مفید ہے۔ اصل میں یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے جو کراچی یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے تیار ہوا۔ اس لحاظ سے بھی یہ کتاب تحقیق کے طلبہ کے لیے راہنما ثابت ہوگی۔

کتاب کی طباعت و تجلید خاصی معیاری اور قیمت (۳۰۰ روپے) موزوں ہے۔ آغاز کتاب میں متعدد اصحاب علم کی فاضلانہ تقریظات ہیں جن میں کتاب کی مختلف خوبیوں کو اجاگر کیا گیا ہے (محمود احمد غازی)۔

رسائل و مسائل کامل (فارسی)، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔ ترجمہ: سید احمد مودودی چشتی۔ ناشر: دارالعروبہ دعوۃ الاسلامیہ، منصورہ، لاہور۔ صفحات: ۱۴۸۶۔ قیمت: درج نہیں۔

مولانا مودودیؒ کے تصنیفی سرمائے میں رسائل و مسائل (کے چار حصوں) کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ غالباً تفہیم القرآن کے بعد، ایسا تنوع اور جامعیت، ان کی کسی اور تالیف میں نہیں ہے۔ اسی وجہ سے رسائل مذکور، قارئین کے مختلف حلقوں میں آج بھی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں اور ان کی بہ کثرت اشاعت ان کی مقبولیت کی دلیل ہے۔

فارسی میں مولانا کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ ہو چکا ہے (تفہیم القرآن، خطبات، تجدید و احیاے دین، مسئلہ جبر و قدر، مسئلہ ملکیت زمین، اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر، تفہیمات، الجہاد فی الاسلام وغیرہ) مگر تعجب ہے کہ اب تک فارسی میں رسائل و مسائل ایسی دلچسپ اور اہم کتاب کا ترجمہ نہیں ہوا تھا۔ حال ہی میں جناب فیض الرحمٰن ہمدانی صاحب کی مساعی و اہتمام سے پانچوں حصوں کا فارسی ترجمہ بڑی تقطیع کے تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحات پر مشتمل، ایک ضخیم کتاب کی صورت میں منظر عام پر آیا ہے۔

"رسائل و مسائل" ترجمان القرآن کا ایک مستقل عنوان تھا (اور آج بھی بدستور یہ عنوان برقرار ہے) اس کے تحت مولانا مودودیؒ نے تقریباً نصف صدی تک قرآن، حدیث، فقہ، معاشیات، سیاسیات، جماعت اسلامی سے متعلق بیسیوں، بلکہ سیکڑوں موضوعات پر طرح طرح کے جواب دیے (ختم نبوت، مسئلہ مہدی، حدود شرعی، فتنہ تصویر، پردہ اور پسند کی شادی، ڈاڑھی، غلاف کعبہ کی نمایش، سود، اسلام میں قطع ید، رشوت دینے کی مجبوری، ڈراموں میں اداکاری، قطبین میں نماز، انعامی بانڈز وغیرہ وغیرہ)۔

سید مودودیؒ نے خداداد حکمت و بصیرت سے کام لیتے ہوئے، اظہار و بیان کے بہترین اسلوب میں شافی جواب دیے ہیں۔ وہ معروف معنوں میں ماہر معاشیات تھے، نہ فقیہ، نہ قانون دان اور نہ ماہر عمرانیات،

مگر انھوں نے ان سب شعبوں سے متعلق اشکالات کو، متعلقہ شعبے کے ماہرین ہی کی طرح سلجھا دیا ہے۔ سید مودودیؒ کے جوابات حکمت و بصیرت کے ساتھ ان کے اجتہاد پر دال ہیں۔

"عرض ناشر" میں محترم ہمدانی صاحب نے رسائل و مسائل کی اہمیت اور ان کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے بجا طور پر کہا ہے کہ بیسویں صدی میں جاہلیت نے اپنے عروج پر پہنچ کر عالم انسانیت پر ایک ہمہ پہلو جنگ مسلط کر دی ہے۔ جاہلیت کے اس چنگل سے انسانیت کو آزاد کرانے کے لیے ہمیں بیسویں صدی میں فقط گنے چنے مردان خدا نظر آتے ہیں۔ ان میں امام مودودیؒ کی شخصیت ممتاز ترین حیثیت رکھتی ہے۔ بہت سے لوگ خدمت دین میں لگے ہوئے ہیں اور ہمیں ان کی قابل قدر خدمات سے انکار نہیں ہے لیکن امام مرحوم کا جس نے بھی مطالعہ کیا ہے، وہ تسلیم کرے گا کہ انھوں نے جاہلیت کی جملہ بیماریوں کی صحیح صحیح تشخیص کی ہے اور وحی ربانی کی روشنی میں ان امراض انسانی کا بہترین علاج بھی تجویز کیا ہے۔

ہمدانی صاحب کہتے ہیں: امام مرحوم نے اپنے لیے ایک مفتی کے بجائے معالج کا کردار پسند کیا ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ آپ نے حد درجہ معروف زندگی کے باوجود، گوناگوں مسائل اور مشکل اور پیچیدہ ترین سوالات و اشکالات کے شافی و کافی جواب دیے ہیں۔ ان جوابات میں وہ کسی گروہی یا فرقہ وارانہ تعصب یا جانب داری سے قطعی بالاتر نظر آتے ہیں۔

فارسی قارئین، خصوصاً اہل ایران، زیر نظر کتاب میں واضح کردہ دانش آموز نکات پر غور کریں تو امید واثق ہے کہ انھیں اپنے مطلوبہ انقلاب کی تکمیل میں روشن خیال امام مودودیؒ کی فکر سے کافی مدد ملے گی (رفیع الدین ہاشمی)۔

اسلام یہ ہے، محمد الغزالی۔ ترجمہ: ابو مسعود اظہر ندوی۔ ناشر: اسلامک بک فاؤنڈیشن، ۱۷۸۱، حوض سوئی والان، نئی دہلی۔ صفحات: ۲۸۸۔ قیمت: ۷۵ بھارتی روپے۔

محمد الغزالیؒ عربی زبان کے نامور ادیب اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کی تصنیف ھذا دیننا کا اردو قالب ہے۔ ابتدا میں عقائد سے بحث کی گئی ہے۔ مصنف نے توحید، قضا و قدر اور آخرت کے سلسلے میں آیات قرآنی سے استنباط کے علاوہ آفاق و انفس کے شواہد بھی پیش کیے ہیں۔ اس کے بعد "یہ زندگی" میں مساوات، حقوق، عقل کی آزادی، مفلسی اور خوف سے آزادی جیسے عنوانات کے تحت اسلام کے انعامات اور مادی زندگی کی بے حیثیتی کا ذکر ہے۔ پھر حدود، تعزیرات، نکاح و طلاق، معاشرت کے دیگر مختلف پہلو، فرد اور قوم کے تعلقات پر اظہار خیال کیا ہے۔ معاشرتی مسائل پر بحث مختصر ہے اور تشنگی کا احساس دلاتی ہے۔

مصنف ایک جگہ لکھتے ہیں: "عملی اعتبار سے کسی بھی علاقے اور زمانے میں امت' زندگی کو حق کے ساتھ ہم آہنگ کرنے اور اس کے تابع کرنے سے بالکل کنارہ کش نہیں ہوئی" مگر مناسب ہوتا اگر علامہ غزالیؒ اقامت دین کے لیے ہونے والی مساعی کا بھی تذکرہ کر دیتے۔ احیاے دین کی کاوشوں کے تذکرے کے بغیر' لکھی جانے والی کتابیں قارئین کو اوراد و وظائف کی طرف تو متوجہ کرتی ہیں لیکن کفر کو مغلوب کرنے اور حق کو غالب کرنے کی جدوجہد کا حصہ نہیں بناتیں۔ نتیجہ یہ کہ مطالعے کے بعد اسلام کے فضائل پر تو اتفاق ہو جاتا ہے لیکن ظلم و زیادتی اور کفرو سرکشی کے خاتمے کے لیے کوئی سرگرمی منظم نہیں ہو پاتی۔

ایک طویل عرصے تک عربی زبان رشد و ہدایت کا منبع بنی رہی۔ بعدازاں فارسی زبان میں دینی و علمی تصنیفات' صدیوں تک ہماری علمی پیاس بجھاتی رہیں۔ پھر اُردو زبان دینی و تحقیقی اور ادبی و سوانحی تخلیقات سے مالا مال ہوئی۔ اب بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ عربی و فارسی کے بعد دینی کتب کا سب سے بڑا ذخیرہ اُردو زبان میں ہے۔ دعوت دین کے موضوع پر بھی اُردو زبان میں بہت سی موثر' جامع اور جان دار اسلوب کی حامل کتابیں موجود ہیں۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو زیر نظر کتاب میں ہمیں کوئی انفرادیت نظر نہیں آتی۔ یہ کوئی تحقیقی و علمی کتاب نہیں' مگر اسلام کی تعلیمات کو مختصراً اور عمومی طور پر سمجھنے کے لیے بہرحال ایک پرکشش تحریر ہے۔ مصنف نے آخری حصے میں بتایا ہے کہ بعض مسیحی اور مغربی مستشرقین کے اعترافات موجود ہیں کہ اسلام سب سے مکمل اور ترقی یافتہ دین ہے اور اسلامی شریعت' عقل سے ہم آہنگ اور سائنسی حقائق کے مطابق ہے۔ اسی طرح اسلامی فقہ' انسان کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ "آخری بات" کے تحت مصنف نے لکھا ہے کہ: "مسلمان ایک لمبی مدت تک دنیا کی بہترین قوم رہے"۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس وقت: "اسلام کے ساتھ ان کا تعلق مضبوط تھا' جب یہ تعلق کمزور ہو گیا اور دونوں کے درمیان فاصلہ پیدا ہو گیا تو وہ دھیرے دھیرے پیچھے جانے لگے"۔ پھر وہ تاسف کے ساتھ کہتے ہیں: "اور یہاں تک کہ جو لوگ ان سے منزلوں پیچھے تھے' وہ منزلوں آگے نکل گئے" (ص ۲۸۱)۔ اگر یہ سوال اٹھایا جائے کہ آج ہمیں کس چیز کی ضرورت ہے؟ تو مختصر جواب ہو گا: کسی چیز کی نہیں--- صرف اور صرف اسلام' دین اور شریعت سے اپنے تعلق کو استوار اور مضبوط تر کرنے کی۔ کتاب کا اشاعتی معیار اطمینان بخش ہے (محمد ایوب منیر)۔

مطالعہ قرآن ایک نظر میں' یعقوب سردش۔ ناشر: قرآن و سنت اکیڈمی آرمور ضلع نظام آباد' اندھرا پردیش' بھارت۔ صفحات: ۲۸۵۔ قیمت: ۳۵ بھارتی روپے۔

قرآن کی تشریح نہیں بلکہ پارہ بہ پارہ' مضامین قرآن کو مختلف عنوانات قائم کر کے اپنے الفاظ میں موثر

انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ قاری کم وقت میں پورے مضامین اور موضوعات قرآن سے آشنا ہو جاتا ہے۔ ایک تبصرہ نگار کے الفاظ میں: اس میں قرآن کے مختلف گل ہاے رنگا رنگ کو حسین گل دستہ کی شکل میں جمع کر دیا گیا ہے جس کی عطر بیزی دل و دماغ کو معطر کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالباری نے مقدمے میں کہا ہے: "والہانہ انداز' سے حزم و احتیاط سے' صحیفہ بصیرت افروز کی تشریح خوش آہنگ اردو نثر میں کی گئی ہے" (مسلم سجاد)۔

مطبوعات موصولہ

☆ اقبال اور گجرات، ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ۔ ناشر: سلیچ پبلی کیشنز، گجرات۔ صفحات: ۴۱۶۔ قیمت: ۳۰۰ روپے۔ [گجرات کے تعلق سے علامہ اقبالؒ کے سسرالی خاندان، پہلی بیوی، بیٹے آفتاب اقبال سے مراسم، بعض معاصرین، اقبال دوستوں، محققین اور مترجمین وغیرہ کا تذکرہ اور ضروری مباحث۔ اقبالؒ پر تحقیق کرنے والوں کے لیے، تحقیقی اصولوں کے مطابق ایک مفید کتاب مع اشاریہ]۔

☆ سفر کے مسائل، مفتی غلام قادر نعمانی۔ ناشر: موتمر المصنفین، دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک۔ صفحات: ۶۷۔ [بحری، بری اور فضائی سفر میں درپیش مسائل کے بارے میں مستند کتابوں کے فتوے]۔

☆ الادب الجلری فی ابیات صحیح البخاری، مولانا لطافت الرحمٰن۔ ناشر: ادارہ العلم والتحقیق، جامعہ ابی ہریرہ، خالق آباد، نوشہرہ۔ صفحات: ۱۵۸۔ قیمت: درج نہیں۔ [صحیح بخاری میں آئے ہوئے اشعار کی عربی میں تشریح۔ کہیں کہیں اردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ عربی دانوں کے لیے ایک دلچسپ پیش کش]۔

☆ مجلہ المیزان، مدیر اعلیٰ: محمد امین شیوی۔ ناشر: اخوت ٹرسٹ، پوسٹ بکس ۱۳۷۷، اسلام آباد۔ قیمت فی پرچہ: ۳۵ روپے، سالانہ: ۱۲۰ روپے۔ [تعلیمات قرآن کے احیا کے لیے "علوم و معارف قرآنی پر پاکستان کا پہلا مجلہ"... مضامین کا انداز علمی و تحقیقی ہے۔ اشاعتی معیار عمدہ ہے]۔

☆ مسلم سیاسی پارٹی، راشد شاز۔ ناشر: ملی ٹائمز پبلی کیشنز، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔ قیمت: ۱۵ روپے۔ [بھارتی مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ ووٹ کے ذریعے کفار و مشرکین کے نظام جبر کو استحکام بخشیں۔ ایک واضح اسلامی ایجنڈے کے اجرا کے لیے ایک مسلم سیاسی پارٹی کی تشکیل اشد ضروری ہے]۔

مدیر کے نام

شہزاد چشتی 'کراچی

"تحدید نسل اور تربیت اولاد" (اپریل ۹۹) کے حوالے سے ڈاکٹر انیس احمد کا جواب بڑا مدلل ہے۔ انھوں نے اس عنوان پر عام فہم دلائل کے ذریعے بات سمجھانے کی اچھی کوشش کی ہے اور ضروری پہلوؤں کا احاطہ جدید معلومات کی روشنی میں کیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ڈاکٹر انیس تحدید نسل اور اسلام کے موضوع پر اپنے گہرے مطالعہ کی روشنی میں جدید معلومات اور نئے دلائل کے ساتھ ایک کتاب تصنیف فرمادیں۔ مولانا مودودیؒ کی ضبط ولادت بلاشبہ اس عنوان پر ایک اہم کتاب ہے' اس کے باوجود نئے دلائل اور جدید معلومات کی روشنی میں ایک اور کتاب کی ضرورت اپنی جگہ قائم ہے۔

آسی ضیائی 'لاہور

"تحدید نسل اور تربیت اولاد" میں ڈاکٹر انیس احمد کے جواب میں دینی نقطہ نظر سے تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ قرآن اور احادیث اس مسئلے پر واضح رہنمائی دیتے ہیں۔ اصلاً یہ ایک غیر اسلامی رجحان ہے۔

سلمیٰ یاسمین نجمی 'راولپنڈی

"حریم ادب" پر تبصرے (مارچ ۹۹) کے ضمن میں دو وضاحتیں ضروری ہیں' اول: "حریم ادب" ۱۹۸۴ کے آس پاس محترمہ نیر بانو نے قائم کی تھی اور میں اس کی بانی صدر ہوں۔ دوم: عفت ۱۹۵۲ میں نہیں بلکہ بعد ازاں جاری ہوا اور بے چارہ بمشکل دو سال رہا اس کے بعد اس کی جگہ ماہنامہ بتول نے لی جو تقریباً ۴۰ سال سے چھپ رہا ہے اور مجھے اس کی ادارت کرتے ہوئے ۲۵ سال ہو گئے ہیں۔

محمد غوث چوہان 'پشاور

"ڈاکٹر محبوب الحق کے بارے میں" (فروری ۹۹) کے دوسرے پیراگراف میں آپ کا بیان درست نہیں ہے۔ ماسٹر عبدالعزیز صاحب کا اسم گرامی شیخ محمد عبدالعزیز تھا اور ایم اے عزیز کے نام سے مشہور تھے۔ آپ اکبر اسلامیہ ہائی اسکول جموں میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ آپ کی قابلیت اور دسویں جماعت کے سالانہ نتائج کے پیش نظر آپ کو سرکاری ملازمت میں براہ راست ہیڈ ماسٹر لے لیا گیا اور ہری سنگھ ہائی اسکول جموں میں تعینات کر دیے گئے۔ یہ ۳۸-۱۹۳۷ کی بات ہے۔ میں ان دنوں دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ مجھے ان کا شاگرد ہونے کا فخر حاصل ہے۔ آپ جموں سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تو گوجرانوالہ نہیں بلکہ مسلم ماڈل ہائی اسکول بھاٹی گیٹ' متصل سنٹرل ماڈل اسکول لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ میرا ایک بیٹا ۳۰ سال بعد ۶۸-۱۹۶۷ میں دسویں جماعت میں ان کا شاگرد رہا۔

نسیمن فاروق مودودی نے ملک عبد محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵-اے ذیلدار پارک' اچھرہ لاہور سے شائع کیا

زخمی، معذور اور بیمار مجاہدین، مہاجرین کا ادارہ

کشمیر سرجیکل ہسپتال

زیر اہتمام: پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن

- اکتوبر 1990 سے جون 1999ء تک 360000 ہزار مریضوں کا مفت اور مکمل علاج کیا گیا۔
- 1000 سے زائد افراد کو فراست بائٹ سے نجات دلا کر معذور ہونے سے بچایا گیا۔ (الحمد للہ)
- تمام مہاجرین اور عسکری تنظیموں کے مجاہدین کا مکمل اور مفت علاج کیا جا رہا ہے
- کشمیر سرجیکل ہسپتال کے تحت متحدہ جہاد کونسل میں شامل تمام تنظیموں کے کیمپوں 60 فرسٹ ایڈ سنٹر کام کر رہے ہیں
- روزانہ 250 سے 350 مریضوں کو مفت طبی امداد فراہم کی جاتی ہے
- ہسپتال کے زیر اہتمام مہاجرین کے کیمپوں میں چار مستقل ڈسپنسریاں اور چار ایمبولینس گاڑیاں ہمہ وقت مصروف کار ہیں جبکہ کیمپوں میں چار نئی ڈسپنسریاں قائم کی جا رہی ہیں۔
- مظفر آباد اور کوٹلی میں چار ایمبولنس گاڑیاں ہمہ وقت مصروف کار ہیں
- دو نئے وارڈ کی تعمیر جاری ہے
- معذور مجاہدین اور مہاجرین کو 800 سے زائد مصنوعی اعضاء لگائے گئے

ہسپتال کے لئے تعاون صرف کراس چیک / ڈرافٹ کی صورت میں ارسال کریں۔ ٹریولر چیک کی صورت میں رقم ارسال نہ کریں۔

کیا آپ کا بھی اس میں کوئی حصہ ہے







خوش نصیب ہے جو گھر بیٹھے

★ غزوہ ہند میں شریک ہے ★ اپنی ملت کی زخمی شہ رگ سے بہتے لہو پر مرہم رکھ رہا ہے ★ زخمی و معذور مجاہدین و مہاجرین کی خدمت اور عیادت کا ثواب حاصل کر رہا ہے ★ عظیم ملی فریضے کی ادائیگی کر رہا ہے

اور رسول ﷺ سے جنت کی بشارت پا رہا ہے (الحدیث) اور جو اس سے محروم ہے وہ یقیناً بہت ہی محروم ہے

آپ نقد عطیات کے علاوہ ادویات کی صورت میں بھی مدد کر سکتے ہیں

اکاؤنٹ نمبر 1128
بنک آف پنجاب
مظفر آباد آزاد کشمیر

تعاون کے لیے

ڈاکٹر محمود حسین کیانی (میڈیکل سپرنٹنڈنٹ)

کشمیر سرجیکل ہسپتال پولٹری فارم روڈ مظفر آباد آزاد جموں کشمیر

فون۔ 058810-3700







C.P.L. 236

Phone : 7587916
7585590

Monthly TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE,